

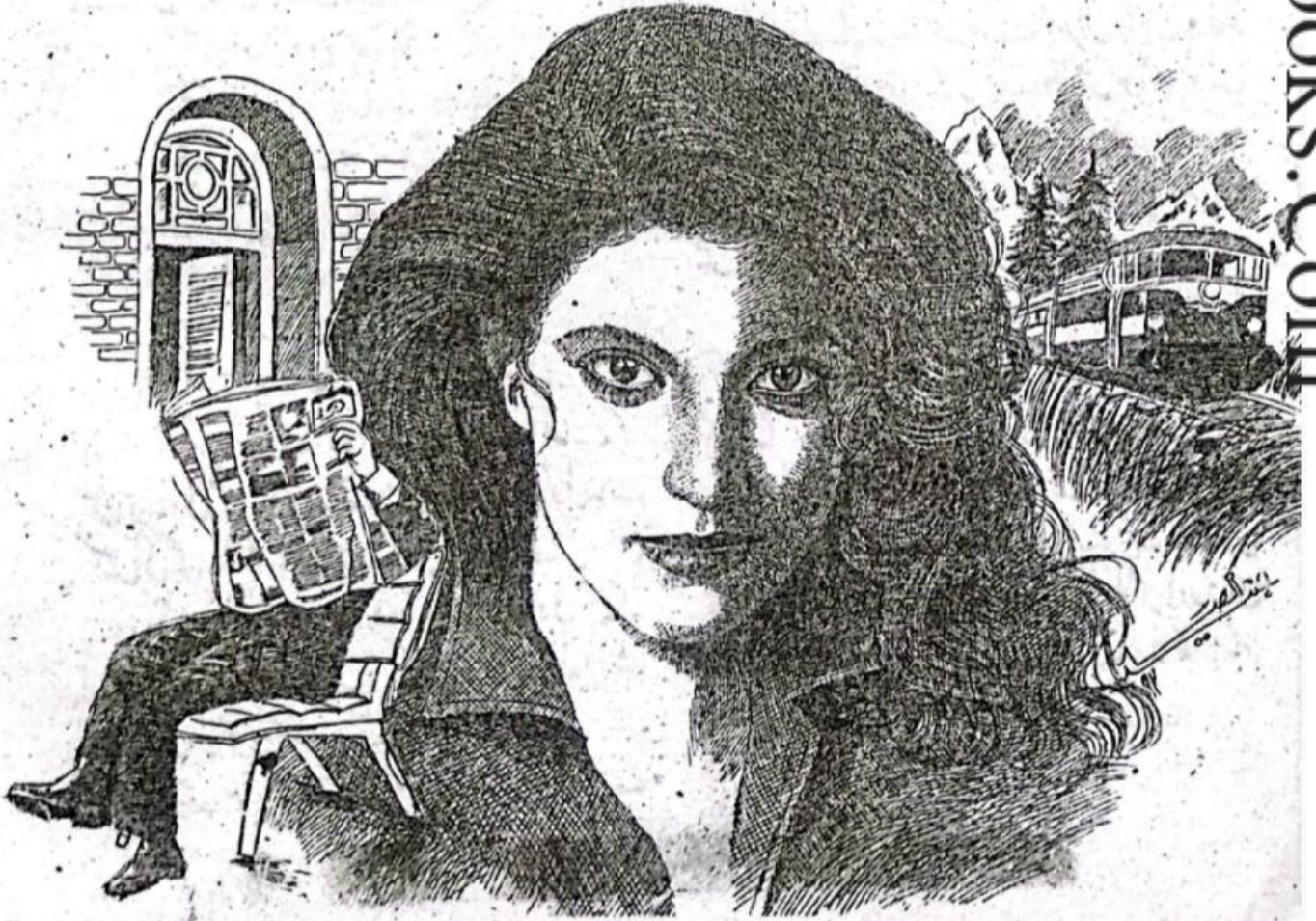
ماء الملوك

مکمل ٹاول

لاہور کے ذکی دروازے کی سمت بہت شان دار حویلیاں تھیں ان میں سے ایک مرزا جہاں زیب کے دادا مرزا ہمایوں بیگ نے بنوائی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں جدید تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ مرزا جہاں زیب اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھے اللہ نے انہیں چار بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔ بیٹوں، بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ اوپر والی منزل میں اورنگ زیب بیگ اور ارباب بیگ رہائش پذیر تھے جب کہ خود جہاں زیب بیگ گرانڈ فلور پر دونوں چھوٹے بیٹوں شازیب اور ظفریاب کے ساتھ رہتے تھے۔ اورنگ زیب کی دو بیٹیاں دو بیٹے تھے۔ ارباب بیگ کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ ظفریاب کا ایک بیٹا آرزین تھا اور شاہ زیب بیگ کی ایک بیٹی زل بھی آرزین اور زمل کا نکاح ہو چکا تھا۔ شاہ زیب بیوی کے مرنے کے بعد گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ظفریاب کی کچھ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ گرفتار ہو گئے تھے، وہ بہت برا وقت تھا، نہ جانے کیا ہوا کہ ان کی بیوی نے ان کے واپس آنے کے بعد طلاق لے لی۔ ظفریاب دوسری شادی کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔

UNNovels.com

ساتویں قسط



ان کی طرف دیکھا۔
 ”نہیں خیر تین چار تھپڑ ہی لگائے تھے میں
 نے۔“ جہاں زیب بیک کے لبوں پر بھی مسکراہٹ
 تھی۔
 ”جی لیکن بھائی جان نے تو وہ بار لگائی تھی کہ

ہم بولے بولے دروازہ کھول رہے تھے کہ
 بی بی اماں نے جو کی کام سے باہر نکلی تھیں چور چور کا شور
 مچا دیا۔ ابا جان، بھائی جان سب ہی جاگ گئے تھے۔
 بس پھر کچھ نہ پوچھیں کیا ہوا۔“
 ”بہت مار پڑی تھی کیا۔“ ثنائے شرارت سے



ہفتوں ہڈیاں درد کرتی رہی تھیں۔“ ظفریاب کو بھی یاد آیا تھا۔
 ”دراصل بھائی جان کو اس بات کا دکھ تھا کہ ہم نے انہیں کیوں نہیں اپنے پروگرام میں شامل کیا۔“
 ارباب بیگ نے قہقہہ لگایا تو سب ہی ہنسنے لگے تب ہی دروازہ کھلا اور شاہ زیب بیگ نے اندر قدم رکھا اور ادھر ادھر تجسس نظروں سے دیکھنے لگے۔ آج جب آئین ڈاکٹر کے پاس سے انہیں لے کر واپس آیا تو بہت خوش تھا۔

”آج ارسلان بھائی نے پورے یقین سے کہا ہے کہ چچا جان اب بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے انہوں نے ڈورم کر دی ہے اور کہا ہے کہ انہیں ہمیں گھمانے کے لیے لے جائیں۔ ماحول کی تبدیلی بھی بعض اوقات بہت اثر انداز ہوتی ہے۔“
 ”ابا۔“ زل بیگ دم کھڑی ہوئی تھی۔

”شاہ زیب بیٹا! جاؤ ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو۔“ جہاں زیب بیگ نے کہا لیکن وہ یوں ادھر ادھر دیکھتے رہے، جیسے کسی کو ڈھونڈ رہے ہوں۔ سب ہی ان کی طرف متوجہ تھے۔
 ”زسی۔“ ظفریاب بے اختیار اٹھ کر ان کی طرف بڑھے وہ کچھ دیر ان کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتے رہے پھر ان کی آنکھوں میں چمک سی نظر آئی۔

”ظفر بھائی! آپ آگئے۔ کہاں تھے آپ بتنا ڈھونڈا ہے ہم نے آپ کو کہاں لے گئے تھے وہ آپ کو۔“

”زسی میرے بھائی!“ ظفریاب نے انہیں گلے سے لگایا۔ اور دونوں بازوؤں میں جھینجے کھڑے تھے۔ جہاں زیب بیگ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
 زل کی آنکھیں بھی نم ہوئیں کہ جب سے ظفریاب آئے تھے ایک بار بھی شاہ زیب نے انہیں نہیں پہچانا تھا۔ حالانکہ گھنٹہ گھنٹہ بھر ظفریاب ان کے پاس بیٹھے رہتے تھے کچھ دیر بعد جب ظفریاب نے انہیں الگ کیا تھا تو ان کی آنکھیں پھر سپاٹ تھیں، ان میں

پہچان کے کوئی رنگ نہ تھے۔ اور وہ ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھنے لگے تھے۔ جیسے کسی کو تلاش کرتے ہوں۔
 ”کچھ چاہیے آپ کو؟“ زل نے قریب آ کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ لیکن وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گئے۔
 ”یہ شیخو بابا کو ڈھونڈ رہے ہیں۔“ زل نے مڑ کر سب کی طرف دیکھا۔

”لیکن ابھی اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور پھر۔“ ظفریاب ابھی تک کھڑے تھے۔
 ”ڈاکٹر ارسلان نے کہا ہے کہ کبھی کبھی انہیں ماضی کا کوئی واقعہ کوئی بات اجاگ یاد آ جائے گی لیکن کچھ دیر بعد بھول جائے گی لیکن ایک وقت آئے گا جب سب یاد آ جائے گا۔ یہ آہستہ آہستہ بہتری کی طرف آرہے ہیں۔ ان شاء اللہ اگلے سات سال بعد جب آپ آئیں گے تو یہ بالکل ٹھیک ہوں گے۔“

ظفریاب نے زسی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ شرمندہ ہو گیا وہ یہ کہتا نہیں چاہتا تھا لیکن بس بے اختیار یہ جملہ اس کے لبوں سے نکل گیا تھا۔
 ”سات سال کیوں بھئی، ابھی تو اگلے سال مرتضیٰ اور مہرین کی شادی ہو رہی ہے اور ارباب نے وعدہ کیا ہے ارباب سے کہ وہ ضرور آئے گا شادی پر۔“ جہاں زیب بیگ نے ظفریاب کی آنکھوں میں پھیلنے کرب کو محسوس کیا تھا۔

”ہاں ہاں ظفر نے وعدہ کیا ہے مجھ سے اور میں تو کہتا ہوں ابا جان، آپ مرتضیٰ اور مہرین کی شادی کے ساتھ ہی زل اور آئین کی شادی کی تاریخ بھی رکھ دیں۔ مونا کہہ رہی تھی کہ ستمبر اکتوبر کی کوئی تاریخ رکھیں گے موسم اچھا ہوتا ہے۔“

”کیا مطلب۔“ مرتضیٰ نے جو حیران حیران سا ارباب بیگ کی طرف دیکھ رہا تھا یک دم پوچھا۔
 ”کیا اماں جان نے آپ کو بتایا نہیں کہ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔“

”ہاں تو ہم کون سا ابھی کر رہے ہیں برخوردار! اگلے سال کی بات ہو رہی ہے۔ تب تک مہرین کا

ہاؤس جاب بھی ہو جائے گا۔“ آج ارباب بیک کا موڈ بہت خوش گوار تھا۔

”لیکن مجھے مہرین سے شادی کرنا ہی نہیں ہے۔ نہ آج نہ پھر بھی۔“ ارباب بیک کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اور انہوں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا تھا کہ اس وقت اور بیک زیب یہاں نہیں تھے۔

”تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ بچپن سے بات طے سے تمہاری اور مہرین۔“

”میں بچپن کے طے کیے ہوئے رشتوں کو نہیں مانتا۔“ وہ ان کی بات کا شاکھڑا ہو گیا۔

”مجھے مہرین سے شادی نہیں کرنی۔ ہرگز نہیں۔“

اماں کو بھی یہ بتا دیں نہیں ہے پسند وہ مجھے۔“

”تم۔“ ارباب غصے سے سرخ ہوتے ہوئے

اٹھے تو ظفر باب نے نرمی سے ان کا ہاتھ تھام لیا اور وہ

زل پر ایک نظر ڈالتا ہوا جو ہکا بکا سی اسے دیکھ رہی تھی

تیزی سے باہر نکلا اور دروازے کے باہر کھڑی سحرش

سے ٹکرا گیا، جو زل کو بلانے آئی تھی۔ ایک قہر آلود نظر

اس پر ڈالتا دھم دھم کرتا ہوا وہ محن عبور کر کے ڈیوڑھی کا

دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کئی دنوں کے بادلوں اور مسلسل رَم جھم کے بعد

آج سورج نکلا تھا، ہرما کی نرم گرم سی دھوپ اچھی لگ

رہی تھی اس لیے ناشتے کے بعد سب ہی صحن میں آگئے

تھے۔ رات ہی ثوبان شاہ کئی ہفتوں کے بعد کراچی

سے آئے تھے۔ وہاں مہرین مل کے عقب میں کچھ

زمین تھی جسے وہ خریدنا چاہتے تھے کہ یہ ان کی بھی

خواہش تھی اور نومی کی بھی کہ وہ اور ریحان مل کر الگ

سے کوئی فیکٹری لگالیں لیکن ریحان نے صاف منع کر

دیا تھا کہ اس وقت وہ ساری توجہ اپنی پڑھائی کی طرف

دینا چاہتا ہے۔ پارٹ ون کے بعد اس کا ارادہ باہر

جانے کا ہے۔ چند سالوں بعد واپس آ کر بھی وہ دو

طرفہ توجہ نہیں دے پائے گا اس لیے بہتر ہے کہ شایان

اور نومی ہی مل کر کام کر لیں۔

”میں نے جو اتنی محنت کی ہے میں اسے ضائع

نہیں کروں گا۔ میرا ارادہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے علاقے میں ایک چھوٹا سا اسپتال بنانے کا ہے۔“ ارباب خاموش ہو گئے تھے حالانکہ وہ چاہتے تھے کہ وہ بزنس کرے۔ میڈیکل میں جانا اس کا شوق تھا سو پورا کر لیا اب نوکریوں کے چکر میں نہ پڑے۔ لیکن جانتے تھے کہ وہ نہیں مانے گا زمین کے سودے کا کام کافی حد تک مکمل ہو گیا تھا۔ ابھی رجسٹری وغیرہ ہوتی تھی کہ بتایا جانے لگا کہ بنیادوں پر سب کو بلالیا تھا۔ سو وہ اکیلے نہیں آئے تھے ریحان اور مہرین شاہ بھی ان کے ساتھ تھے۔

اختربانوان کی اچانک آمد پر جہاں حیران ہوئی

تھیں وہاں ریحان کو دیکھ کر خوش بھی ہو گئی تھیں۔

”نومی کو بھی لے آتے۔“ وہ بے اختیار کہہ بیٹھی

تھیں کہ لاہور سے واپس آنے کے بعد ابھی تک وہ

کراچی نہیں آیا تھا۔

”نومی کو ایک آرڈر مکمل کروانا تھا۔ مہرین بھی

بمشکل نکلا ہے۔ مہرین واپس جائے گا تو اس سے

کہوں گا کہ کچھ دنوں کے لیے اسے بھیج دے۔ اگر بتایا

جانے لے یوں اچانک نہ بلالیا ہوتا تو میرا ارادہ تھا کہ

زمین کا انتقال ہوتے ہی، ہم کچھ دنوں کے لیے

آئیں گے۔“ ان کے لہجے میں وہی ابتدائی دنوں والی

نرمی تھی۔ اختربانوان کا من بھیگنے لگا تھا۔

”بتایا جانے اس طرح اچانک کیوں بلایا

ہے سب کو۔“ اختربانوان نے پوچھا تھا۔

”کچھ اندازہ نہیں ہے مجھے، شاید زمان کو پتا

ہو۔“ اور اس وقت صحن میں دھوپ سے لطف اندوز

ہوتے ہوئے یہ ہی موضوع زیر بحث تھا جب اختربانوان

بھاگی اور اس کی بیٹی کے ساتھ مالتوں کا تازہ جوس نکلا

کر لائی تھیں۔

ثوبان شاہ کو موسم سرما کی دھوپ میں بیٹھ کر کیوں

اور مالنے کھانا اور ان کا فریض جوس پینا بہت پسند تھا۔

ہر سال کی طرح اس بار بھی ان کے دوست نے

سرگودھا سے مالنے بھجوائے تھے، جس کے بھلوال کے

گرد و نواح میں اپنے باغات تھے۔ اختربانوان کے

اشارے پر بھاگی اور سنہری نے ٹرے نیبل پر رکھ دیئے تھے اور اختر بانو سب کو گلاس پکڑانے لگیں۔ اختر بانو کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے ٹوبان شاہ مسکرائے۔

”تھینک یو بانو۔“ سامنے بیٹھی شمینہ سے ہوئے ہوئے باتیں کرتی شمرہ نے اس مسکراہٹ کو دیکھا اور ایک تیز چبھتی ہوئی نظر اختر بانو پر ڈالی۔ اسے ان دنوں ٹوبان کا معمولی سا التفات بھی اختر بانو کے لیے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اختر بانو سب کو جوس سرد کرنے کے بعد واپس جانے کے لیے مڑیں تو امان نے روکا۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں۔ آجائیں ادھر آپ بھی۔“ اس نے ٹوبان شاہ کے دائیں طرف والی خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا جس پر سے ابھی ابھی شایان اٹھ کر گیا تھا۔

”وہ رات مہراں بھائی نے بریانی کی فرمائش کی تھی تو میں ذرا اس کی تیاری کر لوں۔“

”تو پیاری والدہ، مہراں چاچو کی فرمائش تو ان کی بیگم کو پوری کرنا چاہیے نا۔“ امان کا دل چاہا تھا کہ جب سب یہاں اتنے دوستانہ ماحول میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں تو اس کی ماں بھی اس دوستانہ ماحول کا حصہ بنے۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں اپنی عمرانی میں بنوالوں کی بریانی۔“ صفورا جربز ہوئی میں امان کے لیوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”ہاں..... ہاں آجاؤ اختر بانو!“ ٹوبان شاہ نے اپنی قریبی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اور زمان شاہ کی طرف دیکھا۔

”تو تم کیا کہہ رہے تھے کہ تایا جان نے اس طرح کیوں ہم سب کو بلایا ہے۔“

”میرا خیال ہے الیکشن نزدیک آ رہے ہیں تو اسی سلسلے میں کچھ مشورے وغیرہ کرنے میں انہوں نے۔“

”لیکن اس کے لیے بطور خاص ہم سب کو ہنگامی حالات میں بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ ابھی

الیکشن تو دور ہیں اور ظاہر ہے ہم نے تایا جان اور دلاور بھائی کو ہی سپورٹ کرنا ہے۔ الیکشن کمین شروع ہونے پر ہم آ جاتے یہاں۔“

مہراں شاہ کا اس وقت کراچی ہونا ضروری تھا انہیں احساس تھا کہ نومی پر کام کا بہت بوجھ ہوگا۔

”میرا اندازہ ہے اور جو مجھے ادھر ادھر سے سن سکن ملی ہے، تایا جان بیدار بخت کے مقابلے میں صوبائی اسمبلی کے لیے ہم میں سے کسی کو کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ اس بار دلاور کو کھڑا کرنے کا ان کا ارادہ نہیں ہے۔“ زمان شاہ علاقے میں رہتے تھے اس لیے وہ ان سے زیادہ جانتے تھے۔

”لیکن کیوں، یہ سیٹ تو کئی سالوں سے دلاور بھائی کی ہے۔“ مہراں شاہ کو حیرت ہوئی تھی۔

”در اصل آپ کے تایا جان چاہتے ہیں کہ سیٹ ان کے خاندان میں ہی رہے کہ دلاور پچا کے جیتنے کا کوئی امکان نہیں ہے انہوں نے اپنے علاقے کے لیے کوئی کام نہیں کیا جبکہ بیدار بخت نے اسمبلی میں نہ ہوتے ہوئے بھی علاقے کے لوگوں کی فلاح کے لیے کافی کام کیا ہے۔ لوگوں کو مسئلہ ہو کوئی تو بیدار بخت یا زمان پچا کے پاس جاتے ہیں۔ آپ میں سے کوئی بیدار بخت کے مقابلے میں کھڑا ہوگا تو جیتنے کا زیادہ امکان ہے علاقے کے لوگ آپ لوگوں کی عزت کرتے ہیں ایک نام ہے سب کا۔ دلاور چاچو کو لوگ زیادہ پسند نہیں کرتے۔“

امان شاہ بھی یہاں ہی رہتا تھا اور علاقے کے لوگوں سے ملتا جلتا رہتا تھا اس لیے اندازہ تھا اسے۔

”کیوں میرے بھائی نے کیا ظلم توڑے ہیں علاقے والوں پر کہ وہ پسند نہیں کرتے انہیں۔ اور ان کی عزت کیوں نہیں ہوگی۔ انہوں نے کوئی کسی کی۔“ وہ مردوں کی موجودگی کا خیال کر کے مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں۔

”اس لیے چھوٹی امی! کہ وہ سال کے گیارہ مہینے تو حیدر آباد رہتے ہیں سب اور ان گیارہ مہینوں میں چھ سات مہینے دلاور چچا اسلام آباد ہوتے ہیں۔

فصل بکنے اور پھل اترتے وقت ملا جلا کر وہ ایک ماہ یہاں رہتے ہیں اور علاقے کے لوگ سمجھتے ہیں کہ انہیں ان کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے ایک خیال ظاہر کیا تھا آپ کو برا لگا ہو تو معافی چاہتا ہوں۔“ ایمان نے ماں کی طرف دیکھا جو گھبرائی گھبرائی سی بیٹھی تھیں اس لیے معذرت کر لی۔

اس کے اس خیال سے دل ہی دل میں سب متفق تھے لیکن ثمرہ کی دل آزاری نہ ہو اس خیال سے مہران شاہ نے کہا۔

”امان نے ایک سنی سنائی بات کی ہے بھائی! اس کا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اور مجھے تو یوں بھی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہم پہلے کی طرح اس بار بھی دلاور بھائی کو سپورٹ کریں گے اور کیا تانا جان یہاں آ گئے ہیں۔“ ثمرہ کے ماتھے کے تل کچھ کم ہوئے تھے۔ لیکن وہ اب بھی ناراضی سے امان کو دیکھ رہی تھی۔

”میری بابا جان سے بات نہیں ہو سکی وہ اور دلاور بھائی دودن سے اسلام آباد گئے ہوئے تھے اپنی پارٹی کی میننگ میں اور مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں کہ وہ یہاں آ گئے ہیں یا اسلام آباد سے حیدر آباد واپس آئے ہیں۔“

”میری صبح ان سے بات ہوئی تھی وہ کچھ دیر تک پہنچ جائیں گے یہاں۔ مغرب کے بعد ہی انہوں نے سب کو بلایا ہے۔ آس پاس کے علاقوں کے کچھ معززین بھی ہیں۔ زیادہ امکان یہ ہی ہے کہ جو بات چیت بھی ہوگی وہ ایکشن کے حوالے سے ہی ہوگی۔“ زمان شاہ کھڑے ہو گئے تھے۔

”باغات کے ٹھیکے کے لیے کچھ لوگوں نے آج ڈیرے پر آنا ہے۔ میں ان سے بات چیت کر کے گھر آ جاؤں گا۔“ ثوبان شاہ نے سر ہلاتے ہوئے پاس پڑی کین کی چھوٹی سی ٹیبل سے اخبار اٹھایا۔

”مہران یہ جواد احمد کے کالم پڑھتے ہو کیا۔ بہت زبردست لکھتا ہے بہت گہری نظر ہے اس کی اور بہت عمیق مشاہدہ ہے۔“

”نہیں بھائی جان، مجھے کہاں وقت ملتا ہے کچھ پڑھنے کا۔“ مہران شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”چچا جان تو بس ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ ان کی مل کا سوتر دنیا کا سب سے بہترین سوتر ہو۔“

ریحان نے جو خاموش بیٹھا سب کی باتیں سن رہا تھا مسکرا کر مہران شاہ کی طرف دیکھا تو وہ بھی مسکرا دیئے۔

”ہاں میری اور نومی کی ایسی ہی خواہش ہے کہ پوری دنیا میں ہمارے سوتر کی مانگ ہو۔“

”بھی فرصت ملے تو پڑھنا جواد احمد کے کالم کو۔ بہت بے باک اور نڈر ہے۔ سنا ہے یگ ہی ہے۔“

ثوبان شاہ کی نظریں اخبار پر ہی تھیں۔ شمیمہ اور صفورا بور ہو کر اٹھ گئی تھیں۔ ثمرہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی تھی کہ شایان جو کچھ دیر پہلے اٹھ کر چلا گیا تھا واپس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ماؤزر تھا۔

”یہ کہاں سے لیا ہے۔“ ثوبان شاہ کی نظریں اس کے ہاتھ میں موجود سطل پر تھیں۔

”ہادی بھائی سے لیا ہے۔“ اس نے دلاور شاہ کے بیٹے کا نام لیا۔ اسے مختلف قسم کا اسلحہ جمع کرنے کا شوق تھا۔

”لائسنس ہے تمہارے پاس۔“ ثوبان شاہ نہیں چاہتے تھے کہ شایان کے پاس کسی قسم کا اسلحہ ہو وہ جذباتی، غصیلی اور تھکے مزاج کا تھا۔

”ہادی بھائی بنوادیں گے۔ کیسا ہے؟“ اس نے مہران شاہ کی طرف بڑھایا۔ ”میں یہ آپ کو دکھانے کے لیے لایا ہوں۔“

”اچھا ہے۔“ مہران شاہ نے الٹ پلٹ کر اسے دیکھا۔ کراچی جانے سے پہلے انہیں بھی اچھی قسم کی گن رکھنے کا شوق تھا۔

”اس میں گولیاں ہیں بھائی۔“ امان نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

”گولیوں کے بغیر تو یہ محض لوہے کا ٹکڑا ہی ہے نا۔“ وہ مسکرایا۔

”پتا ہے چچا جان وہاں لاہور میں امان کے نانا

”ہاں میں بھی سوچ رہا تھا کہ یہ فریضہ اب ادا ہو جائے تو اچھا ہے۔“ ثوبان شاہ نے اخبار واپس رکھ دیا۔

”میرے ذہن میں سلطانہ کی بیٹی ہے۔ بی اے کر چکی ہے۔ سلطانہ کے سرالی عزیزوں میں سے رشتے آ رہے ہیں اس کے۔ سلطانہ نے پچھلے ہفتے بات کی تھی مجھ سے ان رشتوں کے متعلق لیکن میں نے کوئی بات نہیں کی ابھی نومی کے متعلق اگرچہ دل میں کافی عرصے سے خیال تھا کہ سلطانہ کی بیٹی کو اپنی بہو بناؤں گا۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر تمہاری مرضی ہو تو سلطانہ سے باقاعدہ رشتے کی بات کریں۔“ انہوں نے اختر بانو سے پوچھا۔

”میں..... میں کیا کہوں جو آپ کی مرضی۔“ اختر بانو جیسے کسی خیال سے چونکی تھیں۔

”تم ماں ہو اختر بانو! تمہاری مرضی کے بغیر تو تمہارے بیٹے کا رشتہ طے نہیں کریں گے ہم۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے۔“ ثوبان شاہ کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

”نہیں۔“ اختر بانو نے نفی میں سر ہلایا۔

”مجھے بھلا کیوں اعتراض ہوگا۔ آپ نومی سے پوچھ لیجئے گا۔“ اور نومی بھائی کو میرے خیال میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ وہ تو یوں بھی پچھو اور ان کی فیملی سے بہت اٹیچڈ ہیں۔“ ریحان نومی کے دل کی بات جانتا تھا۔ اسے سلطانہ پچھو کی بیٹی زارا پسند تھی۔

”اختر بانو کے لیوں پر پھکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔“

”پھر بھی نومی کی مرضی معلوم کرنا ضروری ہے۔ اتنے عرصہ سے کراچی میں رہ رہا ہے۔ سلطانہ کے ہاں بھی کم ہی جانا ہوتا ہے۔ کیا پتا اپنی شادی کے متعلق اس کی کیا سوچ ہے۔ کسی بیوی چاہتا ہے۔“

”یہاں سے واپس جا کر میں نومی سے بات کر لوں گا۔“ ثوبان شاہ کو اختر بانو کی بات صحیح لگی تھی۔

”تو بس پھر جلدی شادی کیجئے گا۔ خوب مزا آئے گا۔ آپ کے میکے سے بھی سب آئیں گے نا۔ ہم ساری ریمیں کریں گے تاکہ ان کو بھی ہماری رسموں

جان کے پاس اسٹیفن سن کی بہت خوب صورت گن گھی چھروں والی۔ وہ بتا رہے تھے کہ ٹیک ایج میں انہیں شکار کا شوق تھا تو اپنے کسی دوست کے والد سے خریدی تھی اور پتا ہے وہ بتا رہے تھے ان کے ابا جان کے پاس تھری ناٹ تھری کی گن بھی تھی۔ جو کہیں ادھر ادھر اسٹور میں پڑی ہوگی۔ میں نے ہادی بھائی کو بتایا تو وہ تو تڑپ نہی اٹھے دونوں گنز دیکھنے کے لیے۔“

اس نے مہراں شاہ کے ہاتھ سے اپنا ماؤزر لیا اور الٹ پلٹ کر دچکسی سے دیکھنے لگا۔

”بڑی امی جب بھی آپ لاہور جائیں اور نانا جان کو وہ گن مل جائے تو لے آئیے گا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا وہ بی بی اماں سے کہیں گے ڈھونڈنے کے لیے۔“ بے دھیانی میں اس کے منہ سے نانا جان نکل گیا تھا کہ لاہور کے قیام کے دوران جہاں زیب بیک کے کہنے پر وہ انہیں نانا جان ہی کہنے لگا۔ ثمرہ تڑپ اٹھی تھیں اور اختر بانو کے لیوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”لے آؤں گی۔ لیکن اسے تو رکھونا الجھن ہو رہی ہے مجھے۔“

”لیجیے رکھ دیتا ہوں۔“ اس نے ماؤزر نیل پر رکھ دیا۔ لاہور سے واپس آنے کے بعد اس کا رویہ اختر بانو کے ساتھ بدل گیا تھا وہ جو پہلے ان سے کبھی کوئی بات نہیں کرتا تھا اب باتیں کرنے لگا تھا۔

”ویسے بڑی امی! میں کئی دنوں سے ایک بات سوچ رہا ہوں کہ اب ہمارے گھر میں بھی شادی کے شادیانے بجنے چاہئیں۔ ریحان بھائی اور نومی بھائی کی شادی کے متعلق کیا خیال ہے آپ کا۔“

”ہاں اب نومی اور ریحان کی شادی ہو جانی چاہیے۔“ مہراں شاہ نے بھی تائید کی تو ریحان نے ایک دم ہاتھ جوڑے۔

”مجھے تو ابھی معاف ہی رکھیں۔ جب تک میری تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی میں شادی کا سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ ہاں نومی بھائی کی شادی کا آئیڈیا اچھا ہے۔“

کا چپا چلے۔ ہمارے ہاں کی شادی کی کچھ رسمیں مختلف ہیں۔“ شایان نے بات کرتے کرتے پھر ماؤ زراٹھا لیا تھا اور اسے مختلف زادیوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر یک دم ہی اس نے اس کا رخ امان کی طرف کیا۔

”اگر اس وقت میں اس کا ٹریگر دبا دوں تو۔“ وہ شرارت سے امان کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ کیا حماقت ہے شایان، دکھو اسے اب۔“ مہراں جو اپنے فون پر کوئی نمبر ملاتے ہوئے اٹھے تھے انہوں نے اسے ڈپٹا اور نمبر ملنے پر بات کرتے ہوئے صحن کی طرف چلے گئے۔

”تو امان میرے بھائی۔ اگر میں تم سے کہوں کہ میں تم پر گولی چلانے والا ہوں تو تمہارے دل کی کیا حالت ہوگی۔“ وہ جیسے محظوظ ہو رہا تھا۔ آخر بانو کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔“ امان نے کندھے اچکائے، ثوبان شاہ نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔

”شانی، یہ کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔“ بے فکر ہیں بابا جان! میں کبھی امان کو مار نہیں سکتا۔“ اس نے ہنستے ہوئے ہاتھ نیچے کر لیا۔

”اگرچہ یہ سویتلا بھائی ہے۔ ہماری تاریخ میں تو بادشاہوں نے اپنے سنگے بھائیوں اور بیٹوں کو مروایا ہے۔“

اسے الٹا سیدھا ہانکنے کی عادت تھی لیکن ثوبان شاہ کو غصہ آ گیا تھا۔ جس پر انہوں نے قابو پانے کی کوشش کی تھی لیکن ایک خفگی بھری ناراض نظر اس پر ڈالی تھی۔ لیکن وہ بھی شایان شاہ تھا اسے کسی کی ناراضی اور خفگی کی کم ہی پروا ہوتی تھی۔

”وے بابا جان، آپ کو تاریخ سے دلچسپی ہے۔ مطالعہ بھی ہے آپ کا بہت ہے یہ تو بتائیں کہ اقتدار کے لیے اپنے بھائیوں اور بیٹوں کو بارنا ضروری کیوں تھا۔ اور جی تو طریقے ہو سکتے تھے۔ ان سے جان چمڑانے کے۔ کوئی ایسی حکمت عملی اختیار کرتے کہ سانپ بھی مر جاتا اور لاش بھی نہ ٹوٹی۔“

”شایان تم! اپنے نانا جان سے کہو اس بار وہ تمہیں صوبائی اسمبلی کے لیے کھڑا کریں گا میاں رہو گے۔“ ریحان نے ثوبان شاہ کی خفگی محسوس کر کے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”ضرور کھڑا ہو جاتا ریحان بھائی! لیکن ابھی تو دو سال کے لیے میں لاہور جا رہا ہوں پڑھنے۔ پنجاب یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے اپلائی کیا ہے۔ میں نے۔“

”گڈ۔“ ریحان نے خوشی کا اظہار کیا۔

”لیکن میں نے تمہیں منع کیا تھا شانی، کہ تمہیں لاہور میں ایڈمیشن نہیں لینا۔“ ثمرہ کا خیال تھا کہ اس کے منع کرنے سے اس نے ارادہ بدل لیا ہوگا۔

”لیکن کیوں؟“ وہ ثمرہ کی طرف مڑ گیا تھا۔

”بس میں نے کہہ دیا ہے نہیں تو بس نہیں۔“ ثمرہ کا انداز جھمی تھا۔

”اگر تمہیں ایسا ہی ماسٹر کا شوق چرایا ہے تو کراچی سے کرلو۔ یا حیدرآباد سے ہی۔ اتنی دور لاہور جانے کی ضرورت نہیں۔“

”آپ میرے لاہور جانے سے اتنی خوفزدہ کیوں ہیں۔ کیا آپ کو ڈر ہے کہ بابا جان کی طرح مجھے بھی پنجاب کی کوئی کڑی (لڑکی) پسند آ جائے گی۔“

”سوچ سمجھ کر بولنے کی تو اسے عادت ہی نہیں تھی۔ جہاں ثوبان شاہ کا رنگ سرخ ہوا تھا وہاں آخر بانو کے چہرے کی رنگت بھی بدلی تھی لیکن وہ ثمرہ کی طرف متوجہ تھا۔

”لیکن بے فکر رہیں۔ شادی میں کل رعنا سے ہی کروں گا۔ میرے لیے کل رعنا سے زیادہ حسین اور کوئی لڑکی ہو ہی نہیں سکتی۔ چاہیں تو لاہور جانے سے پہلے نکاح کر دوں میرا۔“

ثوبان شاہ کی موجودگی سے بے پروا ہو کر وہ ثمرہ کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اور ثوبان شاہ دلگاہ تھا کہ کسی نے سچ کہا تھا کہ شخصیت کی اٹھان میں ماحول بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اور ان سے غلطی ہوئی کہ انہوں نے ثمرہ کو اسے حیدرآباد لے جانے کی

اجازت دی تھی۔ ریحان، نومی، امان کوئی بھی اس کی طرح منہ پھٹ اور بے باک نہیں تھے۔

”فصل بولے جارہے ہو تم۔ مجھے ایسا کوئی ڈر نہیں ہے۔“ ثمرہ کو برا لگا تھا کہ اس کی شادی گل رعنا سے کرنے کا خیال ان کے اور ان کے میکے والوں کے درمیان تھا۔ ابھی تک تو انہوں نے اپنا ارادہ ٹوبان شاہ پر بھی ظاہر نہیں کیا تھا اور یہ شادی کا بچہ۔

”میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم لاہور کے بجائے کراچی میں ہی پڑھو۔“

”اوہ اب سمجھا۔ آپ کو بڑی امی کے میکے والوں کا خوف ہے کہ میں نہیں ادھر جا جا کر ان کی محبتوں کا سیر نہ ہو جاؤں کیونکہ آپ بھی جانتی ہیں کہ وہ سب بہت پیارے محبت کرنے والے مخلص لوگ ہیں۔“ وہ بھی ایک کانیاں تھا۔

”لیکن آپ بے فکر ہیں، میرا نانا جان مطلب امان کے نانا جان کے گھر رہنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ہمارا خیال تو ہاسٹل میں رہنے کا تھا لیکن بابا جان کہہ رہے ہیں کہ دو بیڈ کا اپنا اپارٹمنٹ لے لو۔ ایک ملازم یہاں سے ساتھ چلا جائے گا۔ اور مجھے بابا جان کی بات پسند آئی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔“

اپارٹمنٹ ٹھیک رہے گا یا ہاسٹل۔ وہ آنکھوں میں شرارت کی چمک لیے تھوڑا سا ثمرہ کی طرف جھکا۔ غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں ثمرہ کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”بس شایان، بہت ہو گیا۔“ انہوں نے دایاں ہاتھ تھوڑا سا اٹھا کر تیبیہ کی۔

”تم لاہور نہیں جاؤ گے۔ اور اگر گئے تو میرا مرا ہوا منہ دیکھنا۔“

شایان لمحہ بھرا تپیں دیکھتا رہا پھر زور سے ہنس دیا۔

”میں اب بڑا ہو گیا ہوں ڈیرمدر۔ اس طرح کی ایموشن بلیک میلنگ نہیں چلے گی۔ میں بچہ تھا تب آپ کی اس طرح کی دھمکیوں سے ڈر جاتا تھا۔“ ثمرہ کی عادت تھی کہ جب انہیں کوئی بات منوانی ہوتی تو

یوں ہی مرجانے کی دھمکی سے ڈراتی تھیں اسے اور وہ مان بھی جاتا تھا۔

اختربانو ہاتھ گود میں رکھے سہمی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ امان نے دیکھا گود میں رکھے ان کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ اسے دکھ ہوا۔ حویلی کی بڑی بہو اور حویلی کا سارا انتظام سنبھالنے والی، تین جوان بیٹوں کی اس کی ماں آج بھی سہمی سہمی سی تھی۔ اس نے تاسف سے ٹوبان شاہ کی طرف دیکھا جو اختربانو کے ساتھ انصاف نہیں کر پائے تھے۔

”ثمرہ، ختم کرو اس تماشے کو اب۔“ ٹوبان شاہ کو لگا تھا کہ اب ان کا بولنا ضروری ہو گیا ہے ثمرہ کے ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے سب کی موجودگی میں انہیں بے حد سکی اور توہین کا احساس ہو رہا تھا وہ ایک دم اٹھیں۔

”تو ٹھیک ہے دیکھ لو تم بھی اس بار صرف دھمکی نہیں دے رہی میں۔“

”اوں ہوں۔“ بائیں ہاتھ سے شایان نے ثمرہ کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

”آپ جیتیں میں ہارا۔ میں لاہور نہیں جاؤں گا لیکن ایک شرط پر میرے قبرستان جانے پر آپ کو اب اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“ اس نے یک دم دایاں ہاتھ اونچا کر کے ماؤزراپنی کپٹی پر رکھا۔ اور مسکرایا۔

”دادا جان کے دائیں طرف والی خالی جگہ میں بابا۔“

”نہیں!“ اختربانو کے لبوں سے حج کی طرح نکلتا تھا۔ اور وہ بجلی کی سی تیزی سے اس کی طرف بڑھی تھیں۔

”شانی!“ ٹوٹ کر ان کے لبوں سے نکلا تھا۔ ”نہیں۔“

اس کے قریب پہنچ کر انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ماؤزیر لینے کے لیے ہاتھ اونچا کیا اور پھر لہرا کر گزرنے لگی تھیں کہ شایان نے ماؤز نیچے پھینک کر دونوں بازوؤں میں انہیں سنبھالا۔ ٹوبان شاہ، امان شاہ اور ریحان جو سکتے کے عالم میں کھڑے تھے تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

”بڑی امی۔ بڑی امی۔ میں تو بس یوں ہی کہہ

رہا تھا کیا ہو گیا ہے آپ کو۔“

وہ انہیں بازوؤں میں سنبھالے کہہ رہا تھا لیکن وہ بے ہوش ہو چکی تھیں۔ امان نے قریب آ کر انہیں شایان سے لے لیا۔ دہلی پتلی نازک سی اختر بانو کو بازوؤں میں سنبھالے وہ تیز تیز چلتا ہوا برآمدے میں آیا اور وہاں موجود پلنگ پر لٹایا۔ اور بے چینی سے آواز دی۔

”اماں جان۔ اماں جان۔ پلیز۔ آنکھیں کھولیں۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔“

”ریحان بیٹا! اپنی ماں کو دیکھو۔“ ثوبان شاہ اور ریحان بھی اس کے ساتھ ہی برآمدے میں آئے تھے۔

”مانی حوصلہ! ریحان نے امان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے ہٹا کر خود اختر بانو کی نبض چیک کرنے لگا جو بہت مدھم تھی۔

”بھاگی!“ ثوبان شاہ نے بلند آواز میں پکارا۔ ”بی۔ بی۔ چیک کرنے والا آلہ لے کے آؤ۔“

”مفورا بھابی کے کمرے سے۔“

”ریلیکس بابا!“ ریحان نے مڑ کر دیکھا۔ اس کا ہاتھ ابھی بھی ان کی کلائی پر تھا۔ نبض بہت مدھم تھی۔ امان اب ان کے ہاتھ مل رہا تھا اور اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

شایان اور ثمرہ صحن میں اکیلے رہ گئے تھے۔ شایان کچھ دیر یوں ہی کھڑا رہا پھر اس نے ثمرہ کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا برآمدے میں آ گیا۔ ریحان بی۔ بی۔ چیک کر رہا تھا۔

”بہت لو ہے۔“ اس نے بی۔ بی۔ آپریٹر ایک طرف رکھا اور ثوبان شاہ کو بتایا۔

”پانی میں تھوڑا سا نمک اور لیموں ڈال کر لے آؤ۔“ ثوبان شاہ نے بھاگی سے کہا جو ابھی تک وہاں ہی کھڑی تشویش سے اختر بانو کو دیکھ رہی تھی۔

”اماں جان کا دل بہت کمزور ہے۔ شاید وہ شانی کی اس اچانک حرکت کو برداشت نہیں

کر سکیں۔ شاید خوف زدہ ہو گئی تھیں۔“

امان اب ان کے پاؤں کے کلوے سہلا رہا تھا اور ریحان چنچ سے انہیں پانی پلا رہا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھولتی پھر بند کر لیتی تھیں۔

”میں تمہیں اتنا کم حوصلہ نہیں سمجھتا تھا اختر۔“ انہوں نے آنکھیں کھولیں تو ثوبان شاہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا لیکن ثوبان شاہ کی طرف دیکھنے کے بجائے ان کی نظریں ان کے قریب کھڑے شایان پر پڑی تھیں۔ جس کی آنکھوں میں اب بھی حیرت تھی۔ اور ایک اطمینان بھرا سانس لے کر اٹھنے کی کوشش کی تو امان نے انہیں اٹھنے میں مدد دی تھی۔

”آپ کے ساتھ پہلے بھی کبھی ایسا ہوا؟“ ریحان پریشان سا انہیں دیکھ رہا تھا۔

”کبھی دل بہت گھبرا یا ہو لگا ہو کہ ہارٹ بیٹ مس ہو رہی ہے۔“

”دل تو اکثر گھبرا یا ہی رہتا ہے لیکن جب ہارٹ بیٹ مس ہوتی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ ایک لمحے سے بھی کم وقت کے لیے لگتا ہے کہ بس دل بند ہو گیا ہے۔“

وہ ہاتھوں کی پشت سے پسینے کے قطرے پونچھ رہی تھیں۔

”میرا خیال ہے مانی بیٹے! اپنی اماں جان کو کمرے میں لے چلو۔ یہاں یہ بے آرام سی ہیں۔“

ثوبان شاہ نے کہا تو امان نے سر ہلایا اور اختر بانو کے منع کرنے کے باوجود ایک بازوان کے گرد حائل کیے سہارا دیتا بیڈ روم میں آ گیا۔ ثوبان شاہ اور ریحان اور شایان بھی ساتھ ہی کمرے میں آئے تھے۔ اور روم چیرز پر بیٹھ گئے تھے جبکہ امان ان کے بیڈ پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔

”میں اب ٹھیک ہوں۔ آپ سب پریشان نہ ہوں۔“ اختر بانو نادام سی تھیں کہ ان کی وجہ سے سب پریشان ہیں۔

”آپ نے پہلے کبھی کسی ہارٹ اسپیشلسٹ کو

دکھایا۔ ”ریحان کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

”نہیں۔“ اختر بانو نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کوئی ایسی خاص تکلیف تو نہیں تھی کہ ڈاکٹر کو دکھائی بس یہ ہارٹ بیٹ کا ہی تھوڑا سا مسئلہ تھا۔ پندرہ سولہ دھڑکنوں کے بعد لگتا تھا جیسے ایک دھڑکن مسم ہو گئی ہو۔ وہاں لاہور میں مہرین سے ذکر کیا تھا کہ دل بہت گھبراتا ہے تو اس نے کہا تھا کہ آپ کو کسی ہارٹ اسپیشلسٹ کو دکھانا چاہیے۔ آپ کی ہارٹ بیٹ اریگولر ہے۔ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ رخسانہ تائی کو بھی یہ پرابلم ہے لیکن پھر بھی آپ چیک کروالیں۔“

”آپ نے مجھ سے وہاں ذکر کیوں نہیں کیا۔ شاہ زیب کا جو ڈاکٹر علاج کر رہے ہیں۔ ان کے ایک کزن پنجاب کا ڈیالوجی میں ہیں۔ زین بھائی بتا رہے تھے مجھے ایک دن کہ ان کے دوست کے علاوہ اس کے خاندان میں سب ہی ڈاکٹر ہیں۔“

امان اس کے پاس ہی بند پر بیٹھا ہوا تھا۔ ”زین نے کہا تھا کہ وہ مجھے لے چلے گا۔ لیکن بس شادی کی مصروفیت میں خیال ہی نہیں رہا۔ پھر شادیاں بھی تو ایک تین تین تھیں۔“

اختر بانو کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”خیر اب زین کی شادی پر جاؤں گی یا شاید مرتضیٰ کی شادی ہی پہلے ہو جائے تو پھر چیک کروالوں گی۔ تم پریشان مت ہو بیٹا۔“

”کیوں کیا یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے کہ آپ ایک سال انتظار کریں گی۔“

ریحان کی کشادہ پیشانی پر شبنم نمودار ہوئی اور پھر اس نے ثوبان شاہ کی طرف دیکھا۔

”بابا! صبح میں امان جان کو حیدر آباد لے کر جا رہا ہوں۔ وہاں میرے دوست کے فادر کا اپنا چھوٹا سا ہاسپٹل ہے۔ ہارٹ اسپیشلسٹ ہے۔ امریکہ سے ڈگری لے کر آئے ہیں۔ اگر انہوں نے کہا تو کراچی لے جائیں گے۔“

ثوبان شاہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے

اختر بانو کی طرف دیکھا۔

”تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا اختر! کہ تمہیں کوئی تکلیف ہے۔“

اختر بانو نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ ثوبان شاہ دل ہی دل میں نادم سے ہو گئے۔ کتنے سال ہو گئے تھے کہ ان کے درمیان رکی ہاں ہوں کے سوا کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ نادم سے ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”میں ذرا زمان اور مہران کی طرف جا رہا ہوں۔ رات ڈیرے پر جانے سے پہلے آپس میں بھی کچھ طے کرتا ہے کہ ہمارا کیا جواب ہو۔ اور اختر اب آرام کرو۔ اٹھ کر کچن میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھاگی اور تاج کو سب پتا ہوتا ہے کہ کیسے اور کیا کرتا ہے۔“

وہ کمرے سے نکلے تو ریحان بھی ان کے پیچھے ہی گیا تھا۔

”بابا آپ کو امان جان کا خیال رکھنا چاہیے۔ کتنی کمزور ہو رہی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان کا ایچ۔ بی بھی بہت کم ہے۔ گو ہارٹ بیٹ کا مس ہونا اتنا خطرناک نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمیں کوئی وین وغیرہ نہ بند ہو۔“

”اس نے مجھے کبھی بتایا نہیں ریحان کہ اسے کوئی تکلیف ہے۔ اسے بتانا چاہیے تھا مجھے۔ اگر بتاتی تو کیا میں اسے کسی ڈاکٹر کی طرف نہ لے کر جاتا۔ اب مجھے خواب تو نہیں آتا تھا کہ اسے کچھ تکلیف ہے۔“

غیر ارادی طور پر ان کے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔ ریحان نے حیران ہو کر انہیں دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں تو وہ شرمندہ سے ہو گئے۔ بھلا میں کیوں سخ ہوا۔ سچ ہی تو کہہ رہا ہے ریحان مجھے اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے ہی ایسی ہے کم گو اور اپنی تکلیف کا اظہار نہ کرنے والی۔ انہیں یاد آیا تھا کہ شادی کے چند ماہ بعد کی بات تھی اسے بخار تھا اور اس نے انہیں بتایا ہی نہیں۔ اور کچن میں ماسی تاج وغیرہ کو ہدایات دینے

اور ان کی مدد کرنے چلی گئی۔ بلکہ ان کی فرمائش پر ایک دوڈ شز خود بھی بنا میں کہ اس روز انہوں نے کچھ دوستوں کو دعوت پر بلا رکھا تھا لیکن جب وہ چکن سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی تو وہ تیار ہو کر ڈریسنگ میل کے سامنے کھڑے اپنا جائزہ لے رہے تھے مڑ کر اسے دیکھا تو اس کا لال بھوکا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ پہلا خیال جو ان کے دل میں آیا وہ یہ تھا کہ شاید دادی جان نے کچھ کہا ہے کہ دادی اور دادا جان اس شادی کے لیے دل سے رضامند نہ تھے۔

”کیا ہوا؟“ وہ اس کے قریب آئے تھے اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا اور پھر فوراً ہی اٹھ لیا تھا۔

”اوہ میرے خدا تمہیں تو بخار ہے۔“

”گلے میں تکلیف ہے۔ شاید گلے میں انفیکشن ہے اسی لیے بخار ہو گیا ہے۔ جب بھی گھر میں بھی کبھی چیز کھاتی تھی تو ہو جاتا تھا۔“

”تو بتاتا تھا یا یار! میں آج دوستوں کی دعوت نہ کرتا۔ بلکہ تم بتا دیتیں تو میں تم سے فرمائش نہ کرتا خود کچھ پکانے کی۔“

”میں نے سوچا تھا۔ آپ کو خود ہی پتا چل جائے گا۔“ وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔

”کیا مجھے الہام ہوتا تھا؟“ وہ جھنجھلائے تھے۔

”کیا اب الہام ہوا ہے؟“ وہ نکلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبائے مسکراتی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”تم بھی ناختر۔“ وہ بے اختیار ہنس پڑے تھے

لیکن بخار چیک کیا تو وہ ایک سو تین تھا۔

وہ گھبرا کر فوراً ہی اسے ڈاکٹر کی طرف لے گئے

تھے اور زمان سے کہہ گئے تھے کہ وہ ان کے دوستوں کا

استقبال کر لے۔ وہ اختر کو ڈاکٹر کی طرف لے کر

جارے ہیں۔ اور اس روز کے بعد سے وہ خود ہی اس

کا خیال رکھنے لگے تھے۔ ان کے لبوں پر ہلکی سی

مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی۔

انہوں نے ریحان سے کہنا چاہا کہ وہ آئندہ

خیال رکھیں گے لیکن ریحان واپس جا رہا تھا۔ وہ بھی

لیونگ کی طرف چلے گئے۔ جہاں مہران اور زبان موجود تھے۔ ریحان کمرے میں واپس آیا تو سب خاموش تھے۔ شایان بیڈ کے نزدیک کرسی پر بیٹھا تھا۔

”سوری بڑی امی! میری وجہ سے آپ کی

طبیعت خراب ہوئی۔“ اس نے اس کے بازو پر ہاتھ

رکھا تھا۔

”سوری مت کرو بیٹا! میں بس ڈر گئی تھی کہ

تمہیں کچھ ہو گیا تو شمرہ آپا کیا کریں گی۔ وہ تو ایک

بل تمہیں نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔“ اس

نے شایان کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”میں نے سب کو ہی پریشان کر دیا۔“ اس نے

امان اور ریحان کی طرف معذرت طلب نظروں سے

دیکھا تو امان مسکرایا۔

”کوئی بات نہیں یار۔ ویسے ہمیں تو تمہارا شکر

گزار ہونا چاہیے کہ تم اگر وہ حرکت نہ کرتے تو ہمیں

کیسے پتا چلتا کہ ہماری اماں جان کا دل اتنا کمزور ہے

اور وہ اسے کوئی روگ لگائے بیٹھی ہیں۔“

”ماؤں کے دل اپنی اولاد کے معاملے میں

کمزور ہوتے ہیں انہیں کاغذ بھی جیسے تو ان کے دل پر

قیامت گزر جاتی ہے۔“

”لیکن میں تو آپ کی اولاد نہیں ہوں بڑی

امی۔“ بے اختیار ہی شایان کے لبوں سے نکلا تھا۔

”ما میں تو سب کی ساجھی ہوتی ہیں بیٹا چاہے

امان کی ماں ہو چاہے تمہاری۔“

اختر بانو نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر سے اٹھایا

تو شایان چونکا یہ ہاتھ جو ابھی اس کے ہاتھ پر رکھا تھا

اس لمس میں کیا تھا امان کی شفقت، محبت اور

اخلاص۔ وہ دل ہی دل میں اپنی کئی بات پر شرمندہ

ہوا۔ صحیح ہی تو کہہ رہی تھیں وہ کہ ماں تو ماں ہوتی ہے

بھلے وہ کسی کی بھی ہو۔ لیکن اگر امان اس طرح کی

حرکت کرتا تو کیا شمرہ کا رد عمل بھی ایسا ہی ہوتا جیسے اختر

بانو کا تھا شاید نہیں۔ شاید سب ما میں ایک جیسی نہیں

ہوتیں۔ شمرہ بھی مختلف ماں تھی۔

وہ خاموش بیٹھا تھا اختر بانو اسے گاہے گاہے نظر

اٹھا کر دیکھ لیتی تھیں۔

”ایک بات کہوں بیٹا۔ مانو گے۔“

”جی بڑی امی! آپ کہیں۔“

”اپنی بات منوانے کے لیے پھر کبھی یہ طریقہ اختیار نہ کرنا۔ آپ اپنی بات پیار سے لاڈ سے اور ضد کر کے بھی منواتے ہو۔ ماں ہیں تمہاری ماں ہی جانتیں آخر۔“

”بات منوانے کا یہ طریقہ مجھے انہوں نے ہی تو سکھایا ہے بڑی امی! بچپن سے یہ ہی تو کرتی آرہی ہیں میرے ساتھ۔ یہ نہیں کرو گے تو مرجاؤں گی۔ وہ نہیں کرو گے تو چھت سے چھلانگ لگا دوں گی پھر روتے رہتا ساری زندگی وغیرہ وغیرہ، میں نے تو پہلی بار ان کا پڑھایا ہوا سبق دہرایا ہے۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔

”یہ آپ مائیں بڑی بلیک میلر ہوتی ہیں۔ وہ اس طرح بلیک میل کرتی تھیں۔ دھمکی دے کر اور آپ نے اس طرح عملی مظاہرہ کر کے کر لیا۔ بہر حال پراس اب میں ایسا کبھی نہیں کروں گا اور یہ میرا وعدہ ہے۔ شایان ثوبان شاہ کا اپنی بڑی امی سے۔“

وہ ذرا سا مسکرایا تو اختربانو کی نظریں تکی ہی دیر اس کے چہرے پر ٹھہری رہیں۔ اس کی مسکراہٹ میں شاہ زیب کی مسکراہٹ کی جھلک تھی۔ حالانکہ ایمان کی زیادہ مشابہت تھی۔ شاہ زیب سے۔ لیکن وہ بھی کہیں نہ کہیں کچھ مشابہت رکھتا تھا۔ شاہ زیب سے اور اس طرح اتنے غور اور دھیان سے پہلے کب اس نے شایان کو دیکھا تھا۔

”تھینک یو بیٹا!“ وہ ممنون ہوئی تھیں۔

”تھینک یو کا کیا مطلب ہے۔ بڑی امی۔“ اس نے مصنوعی ناراضی سے اسے دیکھا۔ ماؤں کو تو حکم دینا چاہیے۔ یہ تھینک یو تو غیروں سے کہا جاتا ہے بڑی امی۔“

اختربانو نے محبت بھری نظر اس پر ڈالی۔

”ماں ہونے کا جو مان تم نے دیا ہے اس کے لیے اب شکریہ نہیں کہوں گی۔ اب جاؤ شمرہ آپا

تمہارے یہاں اتنی دیر ٹھہرنے سے پریشان ہو رہی ہوں گی۔ ماں ہے نا۔ دل دہل گیا ہوگا۔ اور یہ آخر تم لاہور ہی کیوں جانا چاہتے ہو۔ ماں کا دل دکھا کر مت جانا۔ ان کی خوشی اور رضامندی سے ہی جانا۔“

”کیوں کا جواب تو میرے پاس نہیں ہے البتہ کوشش کروں گا کہ امی مان جائیں۔ ویسے کیا آپ بھی چاہتی ہیں کہ میں لاہور نہ جاؤں۔“ وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

”نہیں، میں بھلا ایسا کیوں چاہوں گی۔ میں تو خوش تھی کہ چلو دونوں بھائی اکٹھے ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے بڑی امی! آپ آرام کریں۔ میں چلتا ہوں۔“ وہ ایک نظریں پر ڈالتا ہوا باہر چلا گیا۔ باہر برآمدے میں آ کر وہ کچھ دیر کھڑا رہا۔ سوچا اپنے کمرے میں جا کر کچھ دیر سو جائے۔ رات دیر سے سویا تھا اور صبح جلدی آنکھ کھل گئی تھی لیکن پھر وہ شمرہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا کہ وہ غصے میں ہوں گی اور ایسا ہی تھا۔

”آگئے ہو اپنی بڑی امی کی خدمت کر کے۔“ اسے دیکھتے ہی وہ بولیں۔

”میں نے بھلا کیا خدمت کرنی تھی ان کی۔ ان کے دو جوان بیٹے اور شوہر نامدار موجود تھے وہاں۔“ اس نے شمرہ کے لہجے کو نظر انداز کیا ”میں تو معذرت کرنے گیا تھا کہ میری وجہ سے ان کی طبیعت خراب ہوئی۔“

”طبیعت خراب ہو گئی تھی یا ڈرامہ کیا تھا اس نے؟“ طنز کرتا ہوا لہجہ اس بار شایان نظر انداز نہ کر سکا۔

”کیا آپ وضاحت کریں گی کہ انہیں ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”سب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اور تمہیں یہ احساس دلانے کے لیے کہ اسے تمہاری بہت فکر ہے۔“ شمرہ ہنستا گئی تھیں۔

”اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی وہ سب کی توجہ میں ہوتی ہیں۔“ وہ سنجیدہ سا کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ ”اور وہ ایک فوری رد عمل تھا۔ اور وہ مجھ سے زیادہ آپ کے لیے پریشان ہو گئی تھیں۔ ماں تھیں تو ایک ماں کے احساسات کو سمجھتی تھیں۔“

ثمرہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر یہ سوچ کر خاموش ہو گئیں کہ اگر اس وقت اس نے اختر بانو کے خلاف کوئی بات کی تو وہ بھڑک اٹھے گا۔ لیکن وہ اختر بانو کو ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی تھیں کہ وہ شایان کے دل کو اپنی مٹھی میں لے لے۔ تو لمحہ بھر سوچنے کے بعد وہ بولیں تو ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”غیر ہو کر اس نے میرا احساس کیا اور تم نے بیٹا ہو کر میرے متعلق نہیں سوچا۔ جھٹ کپٹی پر پستول رکھ لیا۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں نے اسی پستول سے دوسری گولی خود کو مار لیتی تھی۔ میں تو سکتے میں بھی اپنی جگہ سے ہل ہی نہیں سکتی۔ وہ ماں نہیں تھی تمہاری اس لیے اس کے دل پر اس طرح اثر نہیں ہوا تھا۔ جس طرح میرے دل پر ہوا تھا اسی لیے وہ بھاگ کر تم تک پہنچی تھی۔ تمہارے بابا بھائی جن کا تم سے خونی رشتہ تھا وہ سب تو میری طرح ہی سکتے ہیں تھے۔ جہاں تک بے ہوش ہونے کی بات ہے تو شاید دل کمزور ہو۔“

ثمرہ نے بہت ہوشیاری سے پتے کھیلے تھے۔ وہ بھی متاثر نظر آ رہا تھا۔

”سوری امی! لیکن آپ بھی تو خواہ مخواہ ضد کر رہی تھیں۔ آخر میرے وہاں پڑھنے سے آپ کو کیا مسئلہ ہے۔ لوگ اپنے بچوں کو باہر پڑھنے بھیج دیتے ہیں۔ چھوٹی عمر میں ایبٹ آباد اور مری بھیج دیتے ہیں۔ چچا جان کا بھی تو اکلوتا بیٹا ہے فاران اور اسے انہوں نے ایبٹ آباد بھیج رکھا ہے۔ ریحان بھائی اور نومی بھائی کو بھی بابا نے بھیجا تھا نا۔“

”ہاں لیکن میرا اتنا جگر نہیں ہے اختر بانو کی طرح۔“ انجانے میں سچ ہی کہا تھا ثمرہ نے۔

”میں تمہیں کیسے سمجھاؤں شایان میں تمہارے

بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم جتنی دیر میری نظروں سے اوجھل رہتے ہو۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔“

ثمرہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

”آپ بھی بڑی امی کی طرح بہادر نہیں امی۔ نومی بھائی اور ریحان بھائی مہینوں بعد حویلی آتے ہیں۔ اور اب ریحان بھائی جہاں تک میرا خیال ہے چھ سات سال کے لیے باہر چلے جائیں گے۔ مانی بھی تین ماہ تک لاہور چلا جائے گا لیکن چھوٹی امی نے مانی کو منع نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی محبت کا پتھر اس کے شوق کے راستے میں رکھ کر راہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کہتی ہیں۔ پرندوں کو ایک وقت پر اپنے گھونسلوں سے اڑان بھرتا ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح نئی منزلوں کی تلاش میں وقت آنے پر انسان بھی پرندوں کی طرح اپنے آشیانوں سے نکل جاتے ہیں۔“ وہ ہولے ہولے بولتا ہوا جوتے کی ٹو زمین پر مار رہا تھا۔

”میں اختر بانو کی طرح بہادر نہیں ہوں اور شاید اسے اپنے بیٹوں سے اتنی محبت نہیں ہے جتنی مجھے ہے۔ اے اللہ نے بن مانگے اولاد دی۔ میں نے منیس مان مان کر اللہ سے زور کر تمہیں مانگا شایان۔“

انہوں نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

”یاشاید وہ ان ماؤں میں سے ہیں جو اپنی اولاد کے لیے قربانیاں دیتی ہیں ان کے بہتر مستقبل کے لیے اپنے دل پر پتھر رکھ لیتی ہیں۔ اپنی خواہش، آرزو میں پس پشت ڈال کر ان کی خواہش پوری کرتی ہیں۔ مائیں تو سب ایک جیسی ہوتی ہیں امی سب کو ہی اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے کوئی اظہار کر دیتی ہے کوئی نہیں کرتی۔ بڑی امی کہتی ہیں ماں تو ماں ہوتی ہے۔ چاہے وہ امان کی ماں ہو چاہے شایان کی۔“

وہ کھڑا ہو گیا۔ ثمرہ نے جزبز ہو کر پہلو بدلا۔ چند دن لاہور میں اس کے ساتھ کیا رہ کر آ گیا ہے کہ اس کی باتوں کو اس طرح رٹا ہوا ہے جیسے قائد اعظم کے اقوال ہوں۔ ”دل ہی دل میں کہتے ہوئے ثمرہ نے شایان کی طرف دیکھا۔

”اگر تم چاہتے ہو میں بھی تمہارے لیے قربانی دوں۔ اپنے دل پر تمہاری جدائی کا پتھر رکھ لوں تو ٹھیک ہے۔ تم اپنا شوق پورا کر لو۔“ آواز پھر بھرا گئی تھی۔

”تھینک یو امی۔“

اس بے اختیار آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بوسہ دیا اور وہ چند لمحوں کے لیے بالکل سلاکت بیٹھی رہ گئی تھیں انہیں یاد نہیں تھا کہ اس سے پہلے بھی شایان نے ان کے ہاتھوں کو اس طرح محبت اور عقیدت سے چومنا ہونا کی آنکھیں یکدم جگمگ جگمگ کرنے لگی تھیں، خوشی اس کے پورے وجود سے پھوٹی تھی۔ اس نے شمرہ کا ہاتھ آنکھوں سے لگا کر چھوڑ دیا۔

”آپ دنیا کی ساری ماؤں سے اچھی ماں ہیں۔“

اور یہ بات بھی اس نے پہلی بار ہی کہی تھی تو کیا لاہور میں کوئی ایسی کشش ہے کہ اجازت ملنے پر وہ اتنا خوش ہو رہا ہے۔ شمرہ نے صرف سوچا ہی نہیں پوچھ بھی لیا۔

”آخر لاہور میں ایسا کیا ہے جو تم لاہور جانے کے لیے اتنا ڈلے ہو رہے ہو۔“

”لاہور میں کیا ہے۔“

وہ مسکرایا اور آنکھوں کے سامنے زل شاہ کا سراپا لہرایا تھا۔ گرین اور بلیو کے امتزاج والا ڈریس پہنے مجروں سے جچی کلائیاں۔ ہاتھوں میں گرین اور بلیو چوڑیوں والی نوکری لیے سبج سبج سیڑھیوں سے اترتی زل شاہ زیب کا وہ روپ تو جیسے آنکھوں میں کھب گیا تھا۔ اس وقت اگر محسن کا دروازہ کھول کر مرتضیٰ ارباب نہ آ جاتا تو وہ اس سے اس وقت کچھ اور بھی کہہ دیتا شاید یہ کہ اس وقت کوئی اپسرا لگ رہی ہے۔ کسی دوسری دنیا سے آئی کوئی حسین شہزادی۔

اچھا ہی تھا وہ آگیا تھا اور نہ وہ اس کے ایک ہی جیلے پر اس کی آنکھوں کا وہ حیران سا۔ ناگوار تاثر جنہیں بانی کے دنوں میں ذہ زائل کرنے کی کوشش

کرتا رہا۔

”لاہور بذات خود بہت بڑی کشش ہے سو میٹ مام۔۔“

”کیا کوئی لڑکی ہے وہاں؟ کوئی راگ نمبر کا چکر تو نہیں ہے۔“

شمرہ جانتی تھیں کہ وہ راگ نمبر پر لڑکیوں سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ ہادی اور رضی وغیرہ بھی راگ نمبر پر دوستیاں کرتے رہتے تھے۔ اور جب سب مل کر بیٹھتے تو ان بے وقوف لڑکیوں کا خوب مذاق اڑاتے تھے۔ شمرہ نے بھی منع نہیں کیا تھا۔

”ارے نہیں ذریعہ والدہ“ وہ بے اختیار منس دیا۔

”آپ کو کیا لگتا ہے کہ آپ کا بیٹا راگ نمبر پر بات کرنے والی لڑکی کے پیچھے پاگل ہو کر اس کی خاطر کہیں جائے گا۔ لڑکیاں آپ کے بیٹے کے پیچھے بھاگتی ہیں۔“

لہجے میں خود بخود ایک غرور سا ہو گیا تھا اسے وہ کراچی سے آنے والی لڑکی یاد آ گئی تھی جسے رضی اور ہادی نے بمشکل واپس کراچی بھجوا دیا تھا۔

”میری زندگی میں تو بس ایک ہی لڑکی ہے جسے میری امی جان نے میرے لیے پسند کیا ہے۔ گل رعنا۔“

شمرہ کے لیوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”گل رعنا جیسی کوئی لڑکی ہے بھی نہیں۔“

”شایان ثوبان شاہ جیسا بھی کوئی نہیں ہے۔“ مسکراہٹ اب بھی اس کے لیوں پر ٹھہری ہوئی تھی۔

”ہاں واقعی شایان جیسا کوئی نہیں تھا۔ اپنے متیوں بھائیوں کے ساتھ کھڑا ہوا وہ سب سے حسین لگتا تھا۔ شمرہ نے دل ہی دل میں نظریں دعا پڑھ کر پھونکا اور وہ ایک بار پھر شمرہ کا شکریہ ادا کرتا ہوا کمرے سے باہر نکلا تو نظر ریحان پر پڑی جو برآمدے میں آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ آنکھیں موندے پشت پر سر رکائے۔ ٹانگیں پھیلائے وہ اسے کچھ پریشان سا لگا تھا۔

”کیا بڑی امی کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔“
اسے خیال آیا اور وہ اپنے کمرے میں جانے کے
بجائے ریحان کے پاس آگیا۔
”ریحان بھائی! بڑی امی کی طبیعت کیسی ہے

اب۔“
”ہاں۔“ وہ آنکھیں کھول کر سیدھا ہو کر بیٹھ
گیا۔ ”ٹھیک ہیں۔ سو گئی تھیں۔ اس لیے باہر چلا
آیا۔“ اماں ان کے پاس ہی ہے کوئی پریشانی والی
بات تو نہیں ہے۔ آپ پریشان لگ رہے ہیں۔“
”میرے خیال میں تو نہیں لیکن مجھ تو ڈاکٹر ہی
جٹائے گا چیک اپ کے بعد، میں تو سوچ رہا تھا کہ بھی
کبھی ہمیں کچھ باتوں کا احساس وقت گزرنے کے
بعد ہوتا ہے۔ اگر وقت پر احساس ہو جائے تو شاید
بہت سے دل ٹوٹنے سے بچ جائیں اور بہت سارے
دلوں کو اس اذیت سے نہ گزرنا پڑے، جس سے وہ
گزرتے ہیں۔“

”ہاں۔ تو ریحان بھائی! بہت ساری باتیں
وقت گزرنے کے بعد اپنے معنی کھودیتی
ہیں۔“ شایان نے اس کی تائید کی۔
”میری زندگی میں بہت سے کچھتاوے ہوں
گے لیکن یہ کچھتاوے شاید آخری سانس تک رہے گا کہ
ہم یعنی میں نے اور نومی نے اماں جان کو دوری کا
عذاب دیا۔ ایک ماں کے لیے کتنا مشکل ہوتا ہوگا
اپنے بچوں سے دور رہنا۔ تمہاری امی سے تمہارا کچھ
عرصہ کے لیے لاہور جانا برداشت نہیں ہوا اور ہماری
ماں کا جگر ادیکھو سالوں سے ہماری جدائی کا زہر پی
رہی ہیں لیکن کبھی شکوہ نہیں کیا۔

ہم مہینوں بعد حویلی آتے ہیں اور چند دن رہ کر
چلے جاتے ہیں اور ان چند دنوں میں بھی صرف
کھانے کی میز پر ان سے ملاقات ہوتی ہے۔
آج احساس ہوا ہے کہ ہمارے آنے پر ان کی
جو آنکھیں نم ہوتی تھیں۔ ہمارے جانے تک وہ نم ہی
کیوں رہتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی لمحہ ہوتا ہے ایسا جو آدمی
کو چھوڑ کر گہری نیند سے جگا دیتا ہے۔ آج کے دن

وہ لمحہ دوبار مجھ پر وارد ہوا۔ ایک لمحہ وہ تھا جب وہ بے
ہوش ہو کر گر گئی تھیں۔ مجھے لگا تھا جیسے میری کائنات
اجڑ گئی ہو۔ زندگی میرے لیے مر جائے گی اگر میری
ماں نہیں رہے گی۔ وہ ماں جسے بھی میں نے دھیان
سے دیکھا بھی نہیں تھا، جس کے پاس بیٹھ کر بھی اپنے
دل کی باتیں نہیں کی تھیں۔ بھی ان کے دل کی باتیں
نہیں کی تھیں۔ وہ ماں جو بنا کچھ کہے حویلی کے بیرونی
گٹ تک رخصت کرنے آئی تھیں اور ان کے لب
مسکمل ملتے رہتے تھے، جو اپنی دعاؤں کے حصار
میں ہمیں رخصت کرتی تھیں اور اللہ کے سپرد کرتی
تھیں۔ ہمارا سفر بخیر و خوبی گزر جاتا تھا۔ اب اس ماں
کی دعاؤں کا حصار ہمارے گرد نہیں ہوگا تو جانے کتنے
حادثے راہوں میں ہمارے خطر ہوں گے۔ مجھے جب
لگا تھا وہ نہیں رہیں گی تو بابا جان اور بھائیوں کے
ہوتے ہوئے بھی میں تنہا اور اکیلا ہو جاؤں گا۔“

وہ ہولے ہولے بول رہا تھا اور شایان بہت
دھیان اور خاموشی سے اس کے ایک ایک لفظ کو سن رہا
تھا۔

”اور دوسرا لمحہ جب مجھ پر وارد ہوا تو اس نے
مجھے جو ادراک دیا، وہ ادراک میرے دل کو نوچتا اور
اذیت دیتا ہے۔ پہلے لمحے نے مجھے صرف اپنے متعلق
سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ انہیں کچھ ہو گیا تو میں کتنا اکیلا
ہو جاؤں گا۔ کون مجھے دعاؤں کے حصار میں رخصت
کرے گا۔ مجھے تب صرف اپنی فکر تھی۔ اپنے نقصان کا
احساس تھا۔ لیکن دوسرے لمحے نے مجھ پر ندامتوں
اور کچھتاووں کے پہاڑ گرا دیے۔

جب اماں جان تم سے کہہ رہی تھیں کہ تمہیں کچھ
ہو جاتا تو شمرہ آیا کیا کرتیں۔ تمہاری جدائی وہ
برداشت نہیں کر سکتیں۔ اسی لیے وہ تمہیں لاہور جانے
سے منع کرتی ہیں۔ ایک ماں کے لیے اپنے بچوں کو خود
سے جدا کرنا آسان نہیں ہوتا وہ تمہیں سمجھا رہی تھیں
اور میں ندامتوں میں بھیجا جاتا تھا کہ یہ بھی تو ایک ماں
ہی ہے جسے ہم نے اپنی دوری اور جدائی کا عذاب دیا
ہے۔ مجھے ان کی پیشانی اور چہرے کی ایک ایک لکیر

میں جدائیوں کی اذیت — نظر آئی۔ وہ اذیت جو مجھے بھی نظر نہیں آئی تھی، اب نظر آ رہی تھی۔

ہم جب چھوٹے تھے تو زیادہ تر بڑی دادی جان اور چھوٹی دادی جان کے پاس رہتے تھے۔ یا پھر سلطانہ پھوپھو کے پاس۔ شاید ہم پہلے پوتے تھے تو وہ ہم سے زیادہ پیار کرتی تھیں یا پھر پتا نہیں کیوں لیکن اب سوچتا ہوں وہ ہمیں اماں جان کے پاس جانے نہیں دیتی تھیں۔ خود میں ہی الجھائے رکھتی تھیں اور ہم نے بھی کبھی ان کے پاس جانے کی خواہش نہیں کی۔

اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ جب چھٹیوں میں ہم گھر آتے تھے تو وہ حسرت سے ہمیں دیکھا کرتی تھیں۔ ہمارا خیال رکتی تھیں۔ ہمارے کھانے پینے کا لباس کا کھیلنے کا پڑھائی کا ہر چیز کا۔ ہمارے بتائے بغیر ہی وہ ہماری پسندنا پسند کے متعلق جانتی تھیں۔ انہیں پتا تھا ہمیں کھانے میں کیا پسند ہے کیا نا پسند ہے۔ جب ہم گھر پر ہوتے تو ہماری پسند کے کھانے پکواتیں۔

اور ہم سب کچھ حق سمجھ کر وصول کرتے رہے۔ اور کبھی نہیں سوچا کہ ہمارا بھی تو فرض ہے کچھ۔ وہ میرے اور نومی کے لیے ایسی ہی تھیں جیسے ثمنینہ اور صفورا چچی اور شمرہ امی۔ الگ سے کبھی کوئی خاص فیلنگ نہیں تھی ان کے لیے لیکن آج دل میں ان کے لیے جو فیلنگ پیدا ہوئی ہیں وہ بالکل مختلف اور الگ ہیں۔ انہوں نے ہمیں جنم دیا۔ ہمارے لیے تکلیف اٹھائی۔

وہ ہماری یاں ہیں۔ آج مجھے ان کی آنکھوں میں جو پیاس اور تشنگی نظر آئی اپنے لیے وہ اس سے پہلے بھی نظر ہی نہیں آئی۔ ہم بھی آتے جاتے ان کے اس طرح گئے نہیں گئے جیسے مانی لگتا ہے۔ ہم نے بھی اس طرح ان کے ہاتھ نہیں چومے جیسے وہ چومتا ہے۔ آنکھوں سے لگاتا ہے۔ مانی حج کہتا ہے شایان! ہمیں تو تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے خاص طور پر مجھے کہ تمہاری وجہ سے مجھے اس رشتے سے آگاہی ہوئی،

جسے ساری زندگی میں فارگرا ہیڈ لیتا رہا۔“ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

”میری ماں ایک دھمی عورت ہے۔ یہ میں نے آج جانا۔ اس سے پہلے میں نے بھی ان دکھوں کو پڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی جو ان کی آنکھوں میں رقم تھے۔ لیکن آج جب میں ان کے کمرے میں بیٹھا تھا اور وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھیں تو میں نے ان کی آنکھوں میں رقم دکھوں کی وہ بے شمار کہانیاں پڑھیں، جو پہلے کبھی نہیں پڑھی تھیں۔ میکے سے جدائی کا دکھ۔ اولاد کی دوری کا دکھ اور سب سے بڑھ کر بابا جان کی بے اعتنائی کا دکھ۔“

اس نے ایک گہری سانس لی۔

”میں نہیں جانتا شانی! کہ بابا جان نے دوسری شادی کیوں کی۔ میری ماں میں کیا کمی تھی لیکن اتنا جانتا ہوں کہ عورت کے لیے اپنے مرد کو تقسیم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ہماری ایک پروفیسر تھیں۔ دو بچے تھے۔ پڑھی لکھی تھیں خوب صورت تھی۔ ان کے شوہر نے دوسری شادی کر لی تو انہیں نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ کئی ہفتوں کے بعد جب وہ کوڑے سے باہر نکلیں تو مایہ بے آب کی طرح تڑپتی تھیں۔

آج پہلی بار میں نے اپنی ماں کے متعلق سوچا کہ وہ بھی تو ایسے ہی تڑپتی ہوں گی کہ وہ بھی تو میڈم کی طرح بہترین شریک حیات تھیں۔ تب ہم بہت چھوٹے تھے، جب بابا جان نے دوسری شادی کی لیکن بڑے ہونے کے بعد کبھی بھی ہم نے ان کا دکھ بانٹنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی اپنے سلی بھرے لفظوں سے ان کے دکھوں پر مرہم نہیں رکھا۔ کبھی اس قیمتی اور انمول رشتے کی قدر نہیں کی۔ تم ایسا نہ کرنا شان۔ کبھی اپنی امی کو دکھ مت دینا خواہش اور آرزو میں تو پوری ہوئی جاتی ہیں کبھی نہ کبھی لیکن یہ رشتے پھر نہیں ملتے۔“

”زیحان بھائی! جو گزر گیا وہ پلٹ کر واپس نہیں آ سکتا۔ لیکن ابھی بہت دیر تو نہیں ہوئی آپ سلامتی کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت ہے سلامتی

کرنے کا۔ کچھ لوگوں کے پاس تو تلانی کا وقت بھی نہیں ہوتا۔

شایان، جو ہمیشہ ہی ریحان کو لاپالی اور لاپرواہ سا لگتا تھا۔ اس وقت بڑا سیانا اور سمجھ دار سا لگتا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا اور اپنے بازو پر رکھے اس کے ہاتھ کو تھپتھپایا۔

”ٹھیک کہتے ہو یا ر! جو وقت گزر گیا وہ تو پلیٹ نہیں سکتا لیکن وقت ہے اس میں تلانی تو کی جاسکتی ہے کچھ نہ کچھ۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھے ذرا ڈیرے تک جانا ہے۔ چلو گے۔ نظام دین کو اس کے نتیجے نے کچھ رقم بھجوائی ہے۔ وہ دیتی ہے۔ وہ ہماری مل میں کام کرتا ہے۔“

”نظام دین چاچا کیا ابھی تک ڈیرے کا سارا کام سنبھالتا ہے۔ اب تو بوڑھا ہو گیا ہوگا۔“

”ہاں ڈیرے پر تو نظام دین چاچا کا ہی سکہ چلتا ہے۔ شایان مسکرایا۔ ”بابا جان اور زمان چچا اسے جانے ہی نہیں دیتے۔ سارا دن بس بیٹھ کر حقہ گڑ گڑاتا ہے اور دوسرے ملازموں پر حکم چلاتا ہے۔“

شایان کی نیند اڑ گئی تھی، وہ ریحان کے ساتھ ہی گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ اور وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے پیدل ہی ڈیرے کی طرف جارہے تھے جب چراغ سائیں ڈیرے کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اور رخساروں پر آنسوؤں کی لکریں سی بنی ہوئی تھیں۔ شاید میلے ہاتھوں سے وہ آنسو پونچھتا رہا تھا۔ بغل میں سیکی سی کپڑے کی گڑیا تھی۔ ابھی وہ کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ اس کی پرسوز آواز ان کے کانوں میں پڑی۔

بابل چڑیاں گڈیاں تیرے گھار (گھر) رہ گئیں۔

دنیا دے سونریاں ربا لے توں کھڈ بنائی
کچھ وقفے کے بعد پھر اس کی آواز بلند ہوئی تھی
کھیاں نصیاں دیاں جھولی دے وچ پے

گئیاں۔ بابل چڑیاں گڈیاں تیرے گھر۔
”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بابا جان اس نیم پاگل شخص کو حویلی سے کیوں نہیں نکال دیتے۔ ہر وقت اپنی منحوس آواز میں ایک ہی گانا گاتا رہتا ہے۔“

شایان کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔
ریحان نے رک کر اسے دیکھا اور پھر چلنے لگا۔
”دھی اور مسکین آدمی ہے یا ر! سال ہا سال سے اس کے خاندان کے لوگ ہی بازوے کا کام سنبھالتے آرہے ہیں۔ جانور بھی جس طرح ان سے مانوس ہیں۔ دوسروں سے نہیں ہوتے۔“

”لیکن یہ پاگل شخص بھلا کیا خیال رکھتا ہوگا جانوروں کا، جسے اپنا بھی ہوش نہیں ہے پچھلے دنوں نانا جان اور دلاور ماموں اپنی حویلی میں آئے ہوئے تھے۔ دلاور ماموں، زمان چچا سے ملنے ہمارے ڈیرے کی طرف آرہے تھے کہ یہ نہ جانے کہاں سے نکل آیا اور انہیں پتھر اٹھا اٹھا کر مارنے لگا۔ نظام دین چاچا نے اسے آکر پکڑا اور ڈیرے سے ہٹالے گیا۔ دلاور ماموں تو بہت غصے میں تھے اور انہوں نے بابا جان سے شاید بات بھی کی تھی لیکن بابا جان نے ابھی تک اسے نکالا ہی نہیں۔“ شایان کو بلاوجہ ہی چراغ سائیں سے چڑ ہو گئی تھی۔

”بابا بہتر سمجھتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے یا کیا نہیں۔ بہر حال میں ان سے بات کروں گا کہ کسی ڈاکٹر سے چیک کروالیں۔ کہیں اس کی ذہنی حالت زیادہ خراب تو نہیں ہو گئی جو یہ مالکوں کو پتھر مارنے لگا ہے۔“

اب وہ ڈیرے میں پہنچ گیا تھا جیسا کہ شایان نے کہا تھا۔ نظام دین احاطے میں چار پانی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ ”اپنے ڈاکٹر صاحب آئے ہوئے ہیں۔“

وہ ہمیشہ ریحان کو ڈاکٹر صاحب ہی کہتا تھا تب سے جب اس نے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لیا تھا۔ ریحان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”آج تو بڑے ڈیرے پر بھی خوب رونقیں

ہیں۔ صبح سے ہی صفائی وغیرہ ہو رہی تھی۔ ایک دو گانیاں کچھ دیر پہلے ادھر سے گزر کر گئی ہیں۔“ وہ بیٹھا نہیں تھا۔

”ہاں آج نانا جان نے سب کو بلا رکھا ہے۔ مہران چچا اور ریحان بھائی بھی اسی لیے آئے ہیں۔“ شایان کو ایک دم بیزاری سی ہونے لگی تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ ریحان نظام دین کو نرم اور پیغام دے تو وہ واپس حویلی جائیں۔ ”کرسیاں منگواؤں یا اندر چل کر بیٹھیں گے۔“

نظام دین نے پوچھا۔

”بیٹھیں گے نہیں نظام چاچا!“

ریحان نے احاطے میں چھٹی چار پائیوں پر نظر دوڑائی۔

”بٹھنے کے لیے کرسیوں کی کیا ضرورت ہے یہ چار پائیاں کس لیے ہیں۔“ اس نے روپے نظام دین کو چڑائے اور بتایا کہ ان دنوں کام زیادہ ہے اس لیے وہ ابھی نہیں آسکا۔ نظام دین کی اپنی اولاد نہیں تھی۔ نتیجے کو بیٹا بنایا ہوا تھا۔

”سنا ہے ڈاکٹر صاحب! اس بار بیدار شاہ بھی ایکشن میں حصہ لیں گے۔“ نظام دین کی عادت تھی جب ریحان یا کوئی اور ڈیرے پر آتا تو اس پاس کی ساری خبریں بغیر پوچھے بتا دیتا تھا۔

”اور اگر ایسا ہوا مطلب وہ کھڑے ہوئے تو اپنے دلاور شاہ جی نہیں جیت سکیں گے۔ لوگ بہت پسند کرتے ہیں بیدار شاہ صاحب کو۔ وقت آیا تو دیکھا جائے گا۔ آپ بے پرکی نہ اڑایا کریں۔“ شایان کو برا لگا تھا۔

”میں تو بس یوں ہی اندازہ بتا رہا تھا بیٹا! عوامی رائے بیدار شاہ کے حق میں ہے۔“ نظام دین ثوبان شاہ کا منہ چڑھا رہا تھا اور ان کے سامنے حل کر اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا اور وہ بھی دھیان سے سنتے تھے۔

اور اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ رات کو جب سب بڑے ڈیرے پر اکٹھے ہوئے تو سب کا یہی

خیال تھا کہ بیدار شاہ آس پاس کے علاقوں میں بہت مقبول ہو رہا ہے۔ ڈیرے پر آنے والے معززین کی بھی یہی رائے تھی کہ اس بار کسی اور کو کھڑا کیا جائے۔ کچھ نے تو زمان شاہ اور ثوبان شاہ کا نام بھی لیا۔ لیکن چونکہ دونوں نے ہی انکار کر دیا تو فیصلہ یہ کیا گیا کہ تایا جان اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں کے نام پارٹی کو دے دیں اور پارٹی جس کو بھی ٹکٹ دے دے۔ اور سب لوگ پوری سپورٹ کریں گے اس کی۔

ریحان اور شایان جی بھر کر بور ہوئے تھے سو فوراً ہی انھہ کھڑے ہوئے تھے۔ دلاور شاہ اپنی حویلی میں تو موجود تھے لیکن ڈیرے پر نہیں آئے تھے، شایان کا خیال تھا کہ وہ ان سے ملنے جائے گا لیکن پھر اس کا ارادہ بدل گیا اور وہ ریحان کے ساتھ ہی حویلی واپس آ گیا تھا کہ اسے خند پوری کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ آج بھی اسے یہ موقع نہیں ملنے والا تھا۔ بڑی حویلی اور ڈیرہ ان کے گھر سے دور نہیں تھا اس لیے وہ پیدل ہی حویلی آئے تھے۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے وہ رکا۔

”بڑی امی کو لے کر آپ کب حیدر آباد جائیں گے۔“

”ناشتے کے بعد ہی نکلیں گے۔ اپاؤ ٹھنٹ تو لے لیا ہوگا میرے دوست نے۔“ ریحان بھی آخر بانو کے بیدروم کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔

”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں ریحان بھائی۔“

اس نے پوچھا۔

”نہیں یار! اس کی ضرورت نہیں ہے میں اور مانی ہوں گے شاید بابا جان بھی چلیں ساتھ۔“

ریحان نے جواب دیا تھا اور آخر بانو کے کمرے کی طرف بڑھا۔

”تو میرا خیال ہے۔ میں بڑی امی کو سلام کر لوں کہ میں تو اب لمبی تان کر سو جاؤں گا اور دس گیارہ سے پہلے نہیں اٹھوں گا۔“

شایان بھی اس کے ہم قدم ہوا۔

ریحان نے ناب پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اندر سے شرہ کی آواز آئی شرہ کی عادت تھی اونچی آواز میں بولنے کی۔

”تم کیا سمجھتی ہو اختر بانو! کہ اپنی نرم نرم اور میٹھی باتوں سے شانی کے دل کو اپنی میٹھی میں لے لو گی۔ وہاں لاہور میں جانے کیا کیا پٹیاں پڑھائی رہی ہو اسے۔ اس نے ایک بار شادی پر جانے کی بات کی تو فوراً تیار ہو گئیں۔ اسے ساتھ لے کر جانے کو کیا سمجھتی ہو تم ہیں۔ وہ میرا بیٹا ہے۔ میں نے اسے پالا پوسایا کیا ہے راتوں کو اس کے لیے جاگی ہوں اور اب تم۔“

”نہیں شرہ آیا! میں بھلا کیوں اسے پٹیاں پڑھاؤں گی۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“

اختر بانو کی آواز میں لرزش تھی۔ ناب گھماتے ہوئے ریحان نے شایان کی طرف دیکھا جس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”میں سب سمجھتی ہوں اختر بانو! تمہارے چلتے۔ اگر آئندہ شانی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو تمہارا وہ حشر کروں گی کہ۔“

شایان نے ریحان کا ہاتھ ناب سے ہٹا کر جھٹکے سے دروازہ کھولا۔

دونوں ایک ساتھ ہی اندر داخل ہوئے تھے سامنے اختر بانو بیڈ کراؤن پر ہاتھ رکھے کھڑی تھیں۔ ان کی رنگت خطرناک حد تک زرد ہو رہی تھی۔ ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ جبکہ شرہ کی دروازے کی طرف پشت تھی۔

”چھوٹی امی بس!“ ریحان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

”یہ آپ میری اماں جان سے کس لہجے میں بات کر رہی ہیں۔“

شرہ کے آدھے لفظ ان کے منہ میں ہی رہ گئے تھے، انہوں نے پلٹ کر پہلے ریحان اور پھر شایان کی طرف دیکھا جو خونخوار نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ریحان کی نظریں بھی شرہ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جبکہ

اختر بانو نے سہارے کے لیے ہاتھ ادھر ادھر مارے اور پھر لہرا کر گر گئیں گرتے ہوئے ان کا سر بیڈ کی پٹی سے ٹکرایا۔

”اماں جان!“ ریحان تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور زمین پر بیٹھتے ہوئے ان کا سر گود میں رکھا۔ دائیں آنکھ کے اوپر سے ماتھے کی کھال ٹھوڑی سی پھٹ گئی تھی۔ جس سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔ اختر بانو کے دوپٹے سے ہی ریحان نے ان کی پیشانی پونچھی اور کلائی پر ہاتھ رکھا نبض رک رک کر چل رہی تھی۔

”شانی! اماں سے کہو گاڑی نکالے۔“ وہ چیخا تھا۔

شایان بھاگتا ہوا باہر چلا گیا۔ شرہ حیران اور پریشان سی کھڑی تھیں یہ بازی کیسے پلٹ گئی تھی۔ وہ تو آج تک ٹوبان شاہ سے شادی سے لے کر اب تک ہر بازی کامیابی سے کھیلتی آرہی تھیں اور اب پتا نہیں شایان نے کیا اور کتنا سنا تھا کیا وہ جان گیا تھا کہ انہیں گاڑی احاطے میں داخل ہونے کا پتا کیوں نہیں چلا تھا اور ٹوبان شاہ کہاں تھے۔ کیا انہوں نے بھی سنا ہوگا کچھ نہیں جانتی تھیں کہ وہ لوگ پیدل آئے تھے اور ٹوبان شاہ ابھی ذیرے پر ہی تھے۔ ان کے اندر آگ لگی ہوئی تھی انہوں نے سوچا تھا کہ سب کے چلے جانے کے بعد ہی اختر بانو سے بات کریں گی۔ اسے اچھی طرح سمجھا دیں گی تاکہ آئندہ وہ شایان سے دور رہے۔ لیکن پھر ان سے صبر نہ ہو سکا تھا اور اماں کے کمرے سے نکلتے ہی وہ دل کی بھڑاس نکالنے آ گئی تھیں۔

”اماں جان! اماں جان! آنکھیں کھولیں۔“ ریحان کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ اور ہاتھ نبض پر تھا تب ہی دروازے پر شایان نظر آیا۔

”اماں گاڑی نکال رہا ہے۔“ اور دھان پان سی اختر بانو کو دونوں بازوؤں میں سنبھالتے ہوئے ریحان تیزی سے باہر نکلا تھا۔ شرہ ایسے ہی کھڑی تھی۔ شایان نے ایک تیز نظر ان پر

ڈالی اور ریحان کے پیچھے لپکا۔

امان کی مدد سے ریحان اختر بانو کو لے کر گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ ایک بازو اختر بانو کے گرد حائل کئے ان کا سر ہٹنے سے لگائے اور دوسرا ہاتھ ان کی کلائی پر رکھے وہ مسلسل آوازیں دے رہا تھا۔

”اماں جان۔ اماں جان ایسا مت کریں۔“

شایان پنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھا تو امان نے گاڑی گیٹ سے باہر نکالی۔

”اماں جان کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے مانی۔ قریب ترین کوئی کلینک جہاں آ سکیں بھی ہو۔“

ریحان کی آنسوؤں میں بھیگی آواز نے شایان کو بھی تڑپا دیا۔ ”انکل بیدار شاہ کے علاقے میں چلو مانی۔ انہوں نے حال ہی میں چھوٹا سا ہسپتال بنوایا ہے۔ وہاں ہر طرح کی جدید سہولتیں ہیں اور میل فی

میل ڈاکٹر ہمارے لیے ہیں انہوں نے۔“

”ادھر ہی جا رہا ہوں۔“

امان جانتا تھا اکثر جاتا رہتا تھا ان کے علاقے میں۔

شایان پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا اور ریحان اختر بانو کی ڈوٹی نبض پر ہاتھ رکھے سوچ رہا تھا کیا تلافی کا وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر اس کے رخساروں کو بھگور رہے تھے۔ اور اختر بانو کی نبض لمحہ بہ لمحہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ اجنبی دوبارہ اپنے والدین کے ساتھ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا تھا لیکن ماسٹر عبدالعزیز کے دل میں امید کی ایک جوت جلا گیا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی زیب النساء کے لیے ایسے ہی ہم سفر کے خواب دیکھے تھے اور اس روز کے بعد بھی انہوں نے سینکڑوں بار دعا کی تھی۔ ”یا اللہ تو بہتر جانتا ہے کہ کیا کس کے لیے اچھا ہے اور کیا برا۔ اگر وہ اجنبی میری زیب النساء کے لیے اچھا ہے تو اسے اس کا نصیب بتا دے۔“

جب جب انہوں نے زیب النساء کو خاموش

بیٹھے کچھ سوچتے دیکھا تھا تب ان کے لبوں سے یہ ہی دعا نکلی تھی۔ اپنی سوچوں میں کم کبھی اس کی آنکھیں جگمگا اٹھتیں۔ کبھی لبوں پر ایک پیاری سی مسکان آ کر ٹھہر جاتی اور کبھی یکدم آنکھوں کی چمک بجھ جاتی، مسکان پھسکی پڑ جاتی اور وہ بے چین سے ہو جاتے تھے۔

اور جب گلی میں سے گزرتے ہوئے ان کا سامنا نور بھری اور اسلم سے ہو جاتا اور ان کی اپنی طرف اٹھتی، کینہ تو ز نظریں ان کے اندر خوف کی ایک لہری دوڑا دیتی اور ان کی نظریں بے اختیار اوپر آسمان کی طرف اٹھ جاتیں۔

”یا اللہ میری بچی کا نصیب کسی نیک بندے سے جوڑنا۔“

ہر روز زیب النساء کو استانی جی کے گھر لے کر جاتے ہوئے راستے بھر سوچتے رہتے شاید آج استانی جی بتائیں کہ ان کا مہمان اپنے والدین کو لارہا ہے لیکن ہر روز امید کی سمجھ بجھ جاتیں۔ ہر روز وہ سوچتے کہ آج خود استانی جی سے پوچھیں گے کہ ان کے مہمان کی طرف سے کوئی خط، کوئی خبر آئی لیکن پھر ہمت نہ پڑتی اور انہیں سلام کر کے خاموشی سے اسکول چلے جاتے۔ انہیں لگتا تھا جیسے ان کے اندر زہرا کی روح حلول کر گئی ہے۔

وہ بھی تو یوں ہی بے چین رہنے لگی تھی اپنے آخری دنوں میں زیب النساء کے رشتے کے لیے۔ تو کیا ان کا وقت بھی پورا ہونے والا ہے۔ اور اگر مجھے کچھ ہو گیا تو زیب النساء اکیلی رہ جائے گی۔ کوئی عزیز رشتہ دار بھی نہیں قریبی جو میرے بعد اس کی ذمہ داری اٹھالیں گے۔

زیب النساء کی فکر انہیں اندر ہی اندر کھائے جاتی تھی۔ بی بی اکثر ہائی رہنے لگا تھا۔ بی بی کا مسئلہ تو انہیں پچھلے کئی ماہ سے تھا۔ بلکہ شاید زہرا کی وفات کے بعد سے ہی یہ مسئلہ شروع ہو گیا تھا تاہم چند ماہ پہلے انہوں نے صیادق آباد اکثر کو دکھایا تھا اور اس نے سختی سے تاکید کی تھی کہ بی بی کی گولی ہر روز

باقاعدگی سے کہانی ہے ناغہ بالکل نہیں کرنا لیکن اب یہ ان کی سستی تھی یا کوتاہی کہ اکثر گولی کھانا بھول جاتے اور اگر کبھی یاد بھی آ جاتا تو یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ لو اب کیا ہر روز گولیاں پھاکتے رہو۔ کبھی سر میں دردمحسوس ہوتا تو پھر لے لیتے تھے۔

اس روز چوہدری عبدالملک کے بچوں کو پڑھا کر اٹھے تو سردرد سے پھٹ رہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ہتھوڑے مار رہا ہو۔ انہیں ابھی استانی جی کے گھر سے زیب النساء کو لینے جانا تھا لیکن گلی میں چند قدم چلے ہی تھے کہ دل گھبرانے لگا۔ کبھی دل یک دم ڈوبنے لگتا اور کبھی یوں لگتا جیسے ابھی پھٹ جائے گا۔ شاید بی۔ پی ہائی ہو رہا ہے وہ استانی جی کے گھر جانے کے بجائے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔ کہ پہلے جا کر بی۔ پی کی گولی کھالوں۔ طبیعت ذرا سنبھل جائے تو پھر جاؤں گا۔ یوں بھی سردرد کی وجہ سے وہ چوہدری عبدالملک کے گھر سے جلدی نکل آئے تھے۔

ماسی نور بھری کے گھر کے قریب پہنچے تو انہیں لگا جیسے ابھی گر جائیں گے انہوں نے دیوار سے ٹیک لگائی کہ قدم اٹھانا محال ہو رہا تھا۔ یہ چند قدم پر تو ان کے گھر کا دروازہ تھا۔ فیک لگا کر گھر کے گہرے سانس لیے۔ اور دل ہی دل میں عہد کیا کہ اب باقاعدگی سے گولی کھائیں گے۔ انہیں زیب النساء کے لیے زندہ رہنا ہے۔ یا اللہ مجھے اتنی مہلت ضرور دینا کہ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ محفوظ ہاتھوں میں دے سکوں۔

وہ سیدھے ہوئے اور اس سے پہلے کہ چند قدم چل کر اپنے گھر جاتے ماسی نور بھری کے نیم دروازے سے اس کی آواز آئی تھی۔ ایک تو اس کی آواز بھی ہی بلند اور کچھ اسے عادت بھی تھی بلند آواز میں بات کرنے کی۔

”ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے۔ تمہارے چاچا نے کیا کیا ہے۔“

”کتنی دفعہ بتاؤں اماں! چاچا کہہ رہا تھا سال دو سال تک ریٹائر ہو جاؤں گا تو اس سے پہلے ہم اپنا

گھر ٹھیک ٹھاک کر لیں ظاہر ہے، اسے واپس اپنے گاؤں آنا ہی ہے۔“

نور بھری کا دیور ریلوے کے محکمے میں ملازم تھا اور گاؤں سے جانے سے پہلے وہ اپنے گھر میں نور بھری اور اسلم کو چھوڑ گیا تھا اس کا گھر پکا تھا جبکہ نور بھری اور اسلم کا گھر کچا تھا۔ ”جب تک میری نوکری ہے تم لوگ ادھر ہی رہ لو اور تھوڑے پیسے اکٹھے کر کے اپنے گھر کو پکا کروالو۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ گھر بند نہیں ہوگا ورنہ بند گھر تو خود ہی ڈھس جاتے ہیں۔“

”ہاں بھئی۔ اس کو اب کیا پتا کہ اپنا گھر تو اس کا تالاق بھیجنا بیچ باج کر کھا گیا ہے۔“

نور بھری کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”تو اب تم بھی مجھے طعنے دو گی۔ میں نے کوئی عیاشی کی ہے۔ سب چیز تو مقدمے اور وکیلوں کی فیسوں میں کھپ گیا تھا۔“ اسلم جھلائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”کہا بھی تھا چاچا سے اس کی بیٹی کا دھشتہ مانگ لے میرے لیے پھر گھر کی فکر نہیں رہے گی۔“

”ہاں وہ تو جیسے کہیں اپنی پڑھی لکھی بیٹی کا رشتہ دے ہی دیتا۔ سب جانتا ہے تیرے کرتوت اور وہ تیرے چاچا کی بیٹی اتنی نخریلی ہے تجھ سے ہی شادی کرے گی جیسے۔“

ماسٹر عبدالعزیز نے ایک بار پھر دیوار سے ٹیک لگائی تھی۔ دم جیسے سنے میں بار بار الجھتا تھا۔

”پر خیر تو گھر کی فکر نہ کر۔“ لمحہ بھر کے توقف کے بعد نور بھری کی آواز سنائی دی تھی ”تیرے چاچے کے واپس آنے سے پہلے گھر خالی کر دیں گے۔“

”کیا؟“ اسلم کی آواز قدرے بلند تھی۔ ”کچھ مال چھپا کے رکھا ہوا ہے کیا؟ میں تو جب مانگتا ہوں چٹا جواب دے دیتی ہو کہ دھیلا تک نہیں ہے تمہارے پاس۔“

”لو۔ میرے پاس کہاں سے آیا مال۔ یہ اپنے

ماسر عزیز کا گھر ہے نا۔ آخر میں یہ ہمارا ہی ہوتا ہے۔“ نور بھری کی آواز میں مسرت کی چچا ہٹ گئی۔

”کیا مطلب۔ ہمارا کیسے ہوا؟“ اسلم کی آواز میں حیرت تھی۔

”تو اب مطلب بھی میں سمجھاؤں۔ تم نے دیکھا ہے ناما ستر کو دو گھڑی کا مہمان لگتا ہے۔ جھل جھل کر تو چلتا ہے بے چارہ۔ چار چھ ماہ سے زیادہ نہیں جینے والا۔ لکھے لو کہیں پھر زبوجی تمہاری اور گھر بھی تمہارا۔“ وہ ہنسی تھی۔

”تیرا بھی جواب نہیں اماں! دور کی سوچتی ہے تجھے۔“

اسلم کا قبضہ ان کے دل پر کسی بھاری پتھر کی طرح لگا تھا اور انہیں لگا جیسے اب کے جو دل ڈوبا تو پھر ابھرے گا نہیں۔ بمشکل دیوار کا سہارا لیتے ہوئے وہ چند قدم چل کر گھر کے دروازے تک آئے۔ کانپتے ہاتھوں سے تالے میں چابی لگائی اور کتنی ہی دیر تک برآمدے میں پڑی چار پائی پر گرے گہرے گہرے سانس لیتے رہے۔ پھر اٹھ کر پی۔ پی کی گولی کھائی۔ دو تین ہی گولیاں رہ گئی تھیں۔ کل ہی نیاز کو شہر بھیج کر منگوا لوں گا۔ اب انہیں ناغہ نہیں کرتا۔ وہ دل ہی دل میں عہد کر رہے تھے۔

پھر وہ اٹھے اور دودھ نعمت خانے سے نکالا اور اس میں مانی ملا کر ”جچی“ بنائی۔ ان کے ابا کہتے تھے اس سے گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے۔ گرمیوں میں آم کھانے کے بعد یہ ”جچی“ ضرور پی جانی تھی کہ بقول ان کے آم کی تاثیر گرم ہوتی ہے اور ”جچی“ اس گرم تاثیر کو کم کر دیتی ہے۔

دودھ میں پانی اور چینی ملا کر جو شربت بنایا جاتا ہے دیہات میں اسے جچی کہتے ہیں۔

ایک گلاس پی کر وہ کچھ دیر یوں ہی بیٹھے رہے۔ واقعی کچھ دیر بعد طبیعت سنبھلنے لگی تھی۔ ذرا مزید بہتر محسوس کیا تو زیب النساء کو لینے کے لیے استانی جی کے گھر کی طرف چل پڑے۔ انہیں اب کیا کرنا چاہیے یہ خیال انہیں پریشان کرتا رہا۔ نور بھری کی وہ زہریلی ہنسی اور اسلم کے قبضے ان کے کانوں میں گونجتے رہے۔ استانی جی کے گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ

فیصلہ کر چکے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

دروازہ استانی جی نے ہی کھولا تھا اور انہیں دیکھ کر زیب النساء کو آواز دی تھی۔

”زیب بیٹی آ جاؤ۔ تمہارے ابا لینے آ گئے ہیں۔“

”آپا جی! مجھے آپ سے ایک بات عرض کرنی تھی اگر اجازت ہو تو کچھ دیر بیٹھ کر بات کر لیں۔“

”نگاہیں جھکائے جھکائے انہوں نے پوچھا۔“

”ہاں۔ ہاں کیوں نہیں آ جا میں اندر۔“

استانی جی نے ایک طرف ہو کر انہیں راستہ دیا تھا اور پھر کتنی ہی دیر تک وہ برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھے سر جھکائے دل ہی دل میں لفظوں کو ترتیب دیتے رہے تھے۔ پھر سوچ کر بات شروع کی۔ پھر ماسی نور بھری کی باتیں سن کر دل اور پریشان ہو گیا۔

”آپا جی آج میری طبیعت بہت خراب تھی۔“

انہوں نے استانی جی اور اسلم کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو انہیں بتائی تو بے ساختہ استانی جی کے لبوں سے نکلا۔

”بڑی ہی پلید عورت ہے یہ نور بھری۔ میں تو اسے ایسا نہیں سمجھتی تھی۔“

”انسانوں کو سمجھنا بڑا مشکل ہوتا ہے آپا جی۔“

ساری زندگی زہرا اسے ماں کی طرح سمجھتی رہی۔ گھر میں کچھ اچھا پکھتا تو ضرور بھیجتی اور یہ۔ اس کی نیت تو دیکھیں آپا جی۔ گھر اور زیب النساء پر نظر لگا کر بھیجی ہوئی ہے کہ کب میں مروں تو یہ قبضہ کر لے۔ میرے گھر پر بھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ آپا جی وہ آپ کا مہمان کیا پھر بھی نہیں آیا۔ کہتا تھا تا کہ والدین کو لے کر آئے گا جلد ہی۔“

بالآخر انہوں نے ہمت کر کے وہ بات کہہ دی جو کہنا چاہتے تھے۔

”آپا تھا ایک روز ملنے۔ دس بارہ دن پہلے۔ کھڑے کھڑے ہی آ کر چلا گیا۔ بتا رہا تھا چند دنوں بعد بڑے بھائی کی شادی ہے۔ دعوت دینے آیا تھا مجھے۔ اب بھلا میں کہاں اتنا لمبا سفر کر سکتی ہوں۔“

فاطمہ بھی بلاتی رہتی ہے لیکن میں منع کر دیتی ہوں کہ خود ہی آ جایا کرو۔ بہت اچھا بچہ ہے ماسٹر صاحب۔ کیا بتاؤں چند دن رہا ہے ادھر تو انسیت ہو گئی ہے۔ بہت عزت کرتا ہے میری۔ کہتا تھا کہ آپ سے ملنے آتا رہوں گا۔“

”رشتے کی بات کی پھر کوئی؟“ استانی جی کی بات سن کر ماسٹر عبدالعزیز نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”نہیں۔ اب تو کوئی بات نہیں کی۔ وہی بات ہی کر کے گیا تھا اس روز جب آپ کی طرف آیا تھا کہ بڑے بھائی کی شادی کے بعد ماں باپ کو لے کر آئے گا۔ اب تو کوئی بات نہیں کی اس نے۔ دوست کے ساتھ آیا تھا شادی کی دعوت دے کر چلا گیا۔“

استانی جی ماسٹر عبدالعزیز کی بات سن کر کچھ حیران ہوئی تھیں کہ پہلے تو خود ہی کہا تھا کہ جب تک وہ اپنے والدین کو لے کر نہیں آئے گا بات آگے نہیں چل سکے گی۔

”کوئی پتا شتا فون نمبر ہے اس کا آپ کے پاس۔“

ماسٹر صاحب جو کچھ سوچ رہے تھے استانی جی نے اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔

”نہیں۔ لیکن آپ کیا سوچ رہے ہیں ماسٹر صاحب۔“

”زندگی بڑی بے اعتبار سی شے ہے آپا جی! ایک لمحے کا بھروسہ نہیں ہے، میں سوچ رہا ہوں کہ اگر کل مجھے کچھ ہو گیا تو میری زیب کا کیا ہوگا؟ ماسی نور بھری اور اسلم تو بھوکے گدھوں کی طرح میری موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ تو میں چاہتا ہوں آپا جی۔“

ان کی نظریں جھک گئیں۔

”کہ اگر اس کا کچھ اتا پتا چل جائے تو جا کر اس سے کہوں کہ مجھے اس کا رشتہ منظور ہے۔ بھلے اس کے ماں باپ راضی نہ بھی ہوئے تب بھی۔ میں ڈر گیا ہوں ماسی نور بھری کی باتیں سن کر اور اپنی زندگی میں

ہی اپنی زیب کو رخصت کرنا چاہتا ہوں وہ لڑکا بہت بھلا اور اچھا لگا تھا مجھے۔ میری زیب کے جوڑ کا ہے۔ میں نے اپنی زیب النساء کے لیے ایسے ہی لڑکے کے خواب دیکھے ہیں آپا جی۔ میرا دل کہتا ہے۔ میری زیب النساء بہت خوش رہے گی اس کے ساتھ۔“

”وہ تو ٹھیک ہے ماسٹر جی لیکن مجھے تو کوئی اتا پتا نہیں معلوم بس اتنا پتا ہے کہ اس کا گھر لاہور میں ہے۔ ادھر رحیم یار خان میں اس کا کوئی دوست ہے جس کے پاس آتا رہتا ہے۔ شاید اقبال کو پتا ہو۔ میں اقبال کو پیغام بھجواتی ہوں کہ میری بات سن جائے۔ یا پھر میں خود ہی جاتی ہوں کل اس کی طرف۔“

استانی جی کو ماسٹر عبدالعزیز کی پریشانی کا احساس تھا۔

”آپ کی بڑی مہربانی ہوگی آپا جی لیکن اگر۔ اگر اس کا اتا پتا نہ معلوم ہو سکے تو۔ آپ نے اقبال کے متعلق بھی بات کی تھی نا تو پھر اقبال سے ہی بات طے کر دیجیے گا۔ میری طرف سے اختیار ہے آپ کو اچھا لڑکا ہے نیک اور شریف ہے بھلے میری زیب کے جوڑ کا نہیں ہے لیکن اسے خوش تو رکھے گا نا۔ میں جلد از جلد زیب النساء کی شادی کرنا چاہتا ہوں آپا جی۔ آپ اگر مہربانی کر کے کل صبح ہی چلی جائیں اقبال کی طرف تو میں آپ کا یہ احسان بھی نہیں بھولوں گا۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہو آپ ماسٹر جی زیب النساء مجھے اپنی فاطمہ کی طرح ہی عزیز ہے۔“

استانی جی نے کچن کی طرف دیکھا۔ زیب النساء ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے باہر آرہی تھی۔ ماسٹر عبدالعزیز کے اندر آتے ہی انہوں نے زیب النساء کو چائے بنانے بھیج دیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)